وفیاتِ ماجدی

یا

نثری مرثیے

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ

مجلس نشریاتِ اسلام ۱/کے-۳- ناظم آباد مینشن نزد برف خانہ - ناظم آباد ۱ کراچی ۱۸

ناشر : مولانا عبدالماجد دریابادی اکاڈمی
ہیڈ آفس ۲۸ کچہری روڈ لکھنؤ

طابع : نیو یونائیٹڈ انڈیا پریس ۴۴ گوئن روڈ لکھنؤ

بار اوّل : دسمبر ۱۹۹۰ء

تعداد : گیارہ سو

قیمت : پندرہ روپے ۱۵

ملنے کا پتہ

(۱) صدق جدید بک ایجنسی کچہری روڈ لکھنؤ
(۲) مولانا عبدالماجد اکاڈمی ۲۸ کچہری روڈ لکھنؤ

(الف)

فہرست مضامین

صفحہ

(۵)

ڈاکٹر و طبیب

(۶)

دیگر حضرات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ مرتّب

مولانا عبدالماجد دریا بادی کے قلم سے تعزیتی مقالے اور شذرے، سچ، صدق اور صدق جدید میں صدہا کی تعداد میں نکلے۔ ان میں سے صرف ۹۲ منتخب کرکے اس مجموعہ میں شائع کئے جا رہے ہیں۔ پہلا بڑا تعزیتی مضمون مولانا حبیب الرحمٰن ندوی نگرامی مرحوم پر ہے اور آخری تعزیتی مضمون ایک دوسرے ندوی نگرامی مولانا محمد اویس پر۔ ندوۃ العلماء سے مولانا کا جو خصوصی تعلق تھا وہ اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ انشاء ماجدی کے جوہر اور موضوعوں کی طرح ان تعزیتی مضامین میں بھی خوب نمایاں ہیں اور ان میں وہ ایک صاحب طرز کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ان میں بعض مضامین مولانا کے اخبار میں شائع ہونے کے بعد دوسرے اخبارات میں کثرت سے نقل ہو چکے ہیں۔

مولانا کی بعض تالیفات کی طرح اس مجموعہ کے بھی دو نام رکھے گئے ہیں، وفیاتِ ماجدی۔ نثری مرثیے۔

مولانا کی یادگار میں قائم ہونے والی عبدالماجد اکاڈمی مرحوم کی تصانیف کی اشاعت کا آغاز اسی کتاب سے کر رہی ہے اس کے بعد انشاء اللہ ان کی دوسری تالیفات خصوصاً سچ اور صدق کے منتخب مضامین مختلف عنوانات کے تحت، بھی رفتہ رفتہ شائع ہوتی رہیں گی۔

حکیم عبدالقوی دریابادی

۲۶ نومبر ۱۹۷۸ء

تعزیت نگار کی تعزیت

پروفیسر رشید احمد صدیقی کا تعزیتی مکتوب

قدوائی صاحب سلام مسنون!

کل اخبار میں مولانا عبدالماجد صاحب مرحوم و مغفور کے سانحۂ رحلت کی خبر پڑھی مرحوم کی وفات سے کتنی وہ طویل قیمتی اور لوع بلو خدمات کی یاد تازہ ہو گئی جن پر مرحوم کی گرانقدر شخصیت اثرانداز رہی تھی مذہب اور اخلاق ادب تنقید معاشرت وصحافت کی کون سی وادیاں نہ تھیں جن سے مرحوم خوش فکری خاموشی سنجیدگی اور قابلیت سے نہیں گزر چکے تھے گزشتہ نصف صدی سے اوپر مرحوم کو جو طویل اور زرّیں زمانہ ہمارے نوابغ کی جیسی جلیل و عظیم شخصیتوں سے متاثر ہونے اور متاثر کرنے کا ملا وہ شاید اب کسی کو نصیب نہ ہو۔ وہ ایک نشان منزل تھے جس کو انھوں نے ہمارے علم و دانش اور تہذیب و ثقافت کے راستہ میں بہت دور تک لا کر نصب کر دیا تھا مرحوم کی علمی، مذہبی ادبی اور اخلاقی خدمات کی تفصیل پیش کرنا ابھی تو کیا بہت دنوں تک ناممکن رہے گا۔ مرحوم و مغفور اب وہاں پہونچ چکے ہیں جہاں ان کا معاملہ اللہ جل شانہٗ کے ساتھ ہے لیکن ہماری ذمہ داری بھی کچھ کم نہیں ہے کہ مرحوم کی دینوی خدمات کا تفصیلی اور بطریق احسن جائزہ لیں تاکہ آئندہ آنے والی نسلوں کی رہبری اور ہمت افزائی میں معاون ہو۔ یہ سطور لکھ رہا تھا کہ محسوس ہوا کہ جیسے دریاباد تاریخی اعتبار سے جیسا کچھ اب مرحوم ہی کے نام سے وابستہ ہو گیا ہے! یہ امتیاز اس صدی میں اور ہمارے ہی دیار کے کسی اور کے حصہ میں شاید ہی آیا ہو۔!
اللہ تعالیٰ مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین

آپ کے غم میں شریک
رشید احمد صدیقی

بنام ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی

۔۔ جنوری ۱۹۷۷ء

مولینا عبدالماجد دریابادی مرحوم

حیات و خدمات ایک نظر میں

ولادت ۱۸۹۲ء ——— وفات ۱۹۷۷ء

۱۔ مارچ ۱۸۹۲ء — ولادت بمقام دریاباد ضلع بارہ بنکی (یو۔پی)

۲۔ ۱۹۱۲ء — کیننگ کالج لکھنؤ (اب یونی ورسٹی) سے بی۔اے۔ کا امتحان پاس کیا

۳۔ ۱۹۱۶ء — باعدہ میں شیخ یوسف الزماں کی دختر سے عقد ہوا

۴۔ ۱۹۱۷ء — انگریزی کتاب سائیکالوجی آف لیڈرشپ لندن سے شائع ہوئی

۵۔ ۱۹۱۸ء — الحاد سے مذہب کی طرف واپسی شروع ہوئی

۶۔ ۱۹۱۸ء — دارالترجمہ حیدرآباد میں ملازمت شروع کی۔

۷۔ ۱۹۱۹ء — نظام حیدرآباد کے یہاں باریابی ہوئی اور علمی پنشن منظور ہوئی جو تا حیات ملتی رہی۔

۸۔ ۱۹۲۵ء — ہفتہ وار سچ لکھنؤ سے جاری کیا

۹۔ ۱۹۲۵ء — صوبہ خلافت کمیٹی اودھ کے صدر منتخب ہوئے

۱۰۔ ۱۹۲۹ء — حج بیت اللہ کی سعادت حاصل ہوئی۔ سفر کے حالات اپنے مخصوص انداز میں سفر حجاز کے عنوان سے لکھے جو آج بھی زائر حرم کے لئے ایک مفید کتاب کی حیثیت رکھتا ہے

۱۱۔ ۱۹۳۳ء — انگریزی ترجمہ قرآن مجید کی مشغولیت کے باعث سچ کو بند کرنا پڑا

۱۲۔ ۱۹۳۵ء — صدق ہفتہ وار جاری کیا

۱۳۔ ۱۹۴۱ء — انگریزی ترجمہ و تفسیر کا پہلا پارہ تاج کمپنی لاہور نے شائع کیا

۱۴۔ سنہ ۱۹۵۰ء صدق کے بجائے ہفتہ وار صدق جدید کا اجرا شروع کیا

۱۵۔ سنہ ۱۹۵۱ء دار المصنفین اعظم گڑھ کی مجلس عاملہ کے صدر منتخب ہوئے

۱۶۔ سنہ ۱۹۵۲ء ملک غلام محمد صاحب گورنر جنرل پاکستان کی دعوت پر پاکستان تشریف لے گئے۔ ڈھائی ہفتہ پاکستان میں کے عنوان سے اپنے مخصوص انداز میں وہاں کے حالات لکھے۔

۱۷۔ سنہ ۱۹۵۹ء لاہور (پاکستان) میں منعقدہ اسلامی مذاکرہ میں ہندوستانی وفد لے گئے

۱۸۔ سنہ ۱۹۶۶ء حکومت یو۔پی نے قابل قدر تصانیف کی بنا پر پانچ ہزار روپے کا انعام دیا

۱۹۔ سنہ ۱۹۶۷ء حکومت ہند کی طرف سے عربی میں فضیلت کی سند ملی

۲۰۔ سنہ ۱۹۶۷ء جناب رادھا کرشنن صاحب صدر جمہوریہ نے یہ سند راشٹرپتی بھون میں عطا کی

۲۱۔ سنہ ۱۹۷۲ء فالج کا پہلا حملہ دریاباد میں ہوا۔

۲۲۔ سنہ ۱۹۷۶ء مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کانووکیشن میں ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی ڈگری صدر جمہوریہ ہند جناب فخر الدین علی احمد صاحب مرحوم نے عطا کی۔

۲۳۔ سنہ ۱۹۷۷ء ۶ر جنوری سنہ ۱۹۷۷ء اپنی قیام گاہ خاتون منزل حیدر مرزا روڈ لکھنؤ میں صبح سوا چار بجے جان جان آفریں کے سپرد کی۔ ایک نماز جنازہ ندوۃ العلماء لکھنؤ میں حضرت مولانا سید ابو الحسن علی میاں صاحب ندوی کی اقتدا میں بہت بڑے مجمع نے پڑھی۔ اور دوسری نماز جنازہ آبائی وطن دریاباد ضلع بارہ بنکی میں حافظ غلام نبی (مرحوم) کی اقتدا میں بعد نماز مغرب پڑھی گئی جس میں قصبہ جوار کے لوگ بہت بڑی تعداد میں شریک تھے۔ تدفین آبائی مکان متصل مخدوم زادگان کے پیچھے درگاہ حضرت مخدوم آبکش میں عمل میں آئی۔

ماں کے قدموں پر

ماہ مبارک ربیع الاول کی پندرھویں ہے اور اپریل کی تیرھویں۔ اتوار کا آفتاب
غروب ہونے کو ہے اور شب دوشنبہ شروع ہونے کو وطن سے دور پردیس میں ایک اللہ
کی بندی پر عالم نزع طاری ہے۔ لڑکی لڑکوں پوتے پوتیوں کا حلقہ، زبانوں پر اللہ کا
نام اللہ کا کلام اور توحید کا کلمہ۔ ادھر آفتاب غروب ہوا ادھر وہ روح پاک کی ۸۵
سے زائد منزلیں طے کئے اپنے مالک کے حضور میں پہونچ گئی — میری جنت انھیں
کے قدموں کے نیچے تھی۔ خوش نصیب تھا میں کہ اتنے عرصہ خدمت کا موقع پایا بدنصیب

منقول از صدق ۲۰ اپریل ۱۹۴۱ء جلد ۷ نمبر ۴

معلوم ہیں کہ ۔ تو یہ اس نعمت کی ایک دن بھی نہ کی اور جو سب سے زیادہ مستحق تھی خدمت کی
اس کی خدمت کا حق ایک بار بھی ادا نہ کیا! حادثہ سخت اور اپنی محرومی و بدنصیبی اس سے سخت تر

نماز کی پابندی کا نہیں نماز کے ساتھ عشق کا یہ عالم تھا کہ اس دور کے اکابرین میں بس چند
ہی مثالیں ایسی ملیں گی، اشراق، چاشت، تہجد کا وہ اہتمام کہ ہم لوگوں کو شاید فرض ہی کے لئے
نصیب ہوتا ہو۔ یہ سن و سال اور تہجد کا یہ التزام کہ کسی موسم میں بھی ناغہ نہ ہونے پائے۔ گرمیوں
کی یہ مختصر راتیں صبح تک بھی نیند پوری ہونی مشکل ابھی پڑیں اور تہجد کیلئے ابھی تو چھ بجے کے جاڑے
پڑ رہے ہیں فجر کے وقت بھی لحاف کے اندر سے نکلنا دشوار، رات کے ایک بجے، دو بجے اور
تین بجے تہجد کے لئے وضو کر رہی ہیں۔ عزیزوں میں کوئی پردیس سے آیا، کوئی بیماری سے
اچھا ہوا، غرض کسی قسم کی بھی خوشی ہوئی اور انھیں نماز شکرانہ ادا کرنے کا گویا حیلہ ہاتھ آ گیا۔ عزیزے
ملیں گی بعد میں نماز کو پہلے کھڑی ہو جائیں گی۔ کسی کے انتقال کی خبر سنی اور رحمت ایصال
ثواب کے لئے نماز کیلئے ہاتھ باندھ لئے صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک جتنی رکعتیں پڑھ ڈالتیں
ان کا علم تو بس اللہ کے فرشتوں ہی کو ہوگا۔

محلہ کی، شہر کی جو عورتیں ملنے آتیں ان پر تبلیغ نماز کی کیا کرتیں، خدا جانے کتنوں
کو نمازی ہی نہیں تہجد گزار بنا دیا۔ نماز ہی کا سا عشق اذان کے ساتھ تھا۔ پردیس میں مکان اگر
ایسا مل جاتا جہاں اذان کی آواز آتی ہو تو باغ باغ ہو جاتیں وطن میں رہتیں تو گھر کے
صحن اور ڈیوڑھی میں برابر اذان دلایا کرتیں کئی سال قبل سے کہہ رہی تھیں کہ مرنے کے
بعد یہ جی چاہتا ہے کہ مسجد کے عین دروازے پر دفن ہوں کہ اللہ کے گھر آنے جانے والے میرے
اوپر سے گزرتے رہیں، خیر یہ نا ممکن ہو تو میری قبر مسجد سے متصل ہی بنے کہ اذان کی آواز
برابر آتی رہے۔

نماز و اذان کے بعد نمبر روزہ کا تھا عمر ستر کی ہوئی اور کچھ کی اور ماشی کی یہاں

کہ بچاسی گزر گئی اور فرض روزہ تو کیا چھوٹتے پاتا۔ عاشورہ محرم اور عشرہ ذی الحجہ اور پندرھویں شعبان کے روزے موسم کوئی سا بھی ہو ترک نہ ہونے پائے جوان ہمت و عزیمت کی یہ مثالیں دیکھ کر دنگ رہ جاتے۔ حج اپنے شوہر مرحوم کے ساتھ ۱۹۱۲ء میں کر آئی تھیں اور کفن کا کپڑا آب زم زم سے دھلا ہوا اسی وقت سے سفر و حضر میں ساتھ رکھنے لگی تھیں دوبارہ حج و زیارت مدینہ کی تمنا عمر بھر رفیق رہی نماز کی طرح ادائے حج کی تبلیغ بھی پاس بیٹھنے والوں کو کیا کرتیں خیر و خیرات داد و دہش کی تو کہنا چاہیے کہ حد ہی نہ تھی ہم لوگوں کے بچپن میں بارہا یہ ہوا کہ گھر میں مٹھائی یا موسمی پھل بہت سے آئے اور ہم خوش ہوئے کہ کئی دن تک کھائیں۔ ذرا دیر میں دیکھا کہ سب تقسیم ہو چکے ہیں۔ اب بڑھاپے میں دیکھا کہ دسترخوان پر کوئی مخصوص چیز ان بڑی بی کی خاطر آئی انھوں نے جھٹ اٹھا کر دوسروں کو بھجوا دی۔

اردو کی شدبد معمولی سی تھی وہ بھی اب بھول بھال گئی تھیں۔ قرآن مجید ناظرہ پڑھی ہوئی تھیں زیادہ رواں وہ بھی نہ تھا اور اب ضعف بصارت کی بنا پر اور زیادہ اٹکنے لگیں تھیں لیکن ہمت میں ذرا فرق نہیں ذوق شوق وہی دھن، جلی حرف کا قرآن لے کر بعد اشراق بیٹھ جاتیں ایک ایک سطر نکالنے میں ایک منٹ لگ جاتا ایسی بار بھلا کہاں مانتیں مذہبی کتابیں آخر عمر میں اپنی پوتیوں سے پڑھوا کر سنتیں۔ قویٰ بجز سماعت گراں گوشی کے عام طور پر آخر تک اچھے رہے، بے تکلف چلتی پھرتیں، کوٹھے پر چڑھتی اترتیں، دعا بھی اسی کی کیا کرتیں کہ یا اللہ ہاتھ پیر آخر وقت تک جواب نہ دیں۔ ہاتھ میں ذائقہ تھا، کھانے کی مخصوص چیزیں کچھ روز پیشتر تک اپنے ہاتھ سے پکاتی رہیں اور عینک لگا کر سبق پر دیتیں، کپڑے اپنے ہاتھ سے قطع گویا بالکل آخر تک کرتی رہیں۔

ادھر کئی سال سے اکثر اسی موسم میں بیمار نزلہ و بخار میں ہو جاتیں اور چند روز بعد اچھی ہو جاتیں اب کی بھی یہی دھوکا رہا خیال سن کی طرف گیا ضرور لیکن جواب نفس نے یہ سمجھا دیا کہ ان کا سن تو ابھی پھر بھی کم ہے ان کی ایک بڑی بہن کی عمر ۹۵ سال کی ہوئی تھی

اوران کی والدہ کی تو اس سے بھی زائد اور پھر معالجین کا اطمینان مستزاد ! غرض کہ پردے پر پردے غفلت کے آنکھوں پر پڑے رہے۔ اور ساعت موعود تو جب بھی آتی ہے ایسی ہی دبے پاؤں اور زیر نقاب آتی ہے! آہ نادان انسان اور اس کے غلط اندازے۔!

"بھیا اب سورۂ یٰسین پڑھ دو" یہ آخری الفاظ تھے جو اس جانے والی ناز اٹھانے والی ہستی کی زبان سے میں نے سنے ہائے کیا معلوم تھا کہ اب اس کے بعد کوئی اور پوری بات اس محبت والی زبان اور شفقت والے ہونٹوں سے سننا مجھ کم نصیب کے نصیب میں نہیں! تعمیل ارشاد میں سورۂ یٰسین ایک بار نہیں دو بار پڑھ کر دم کر دی عارضی سکون ہوا چہرہ پر بحالی آئی لیکن زبان ساتھ نہ دے سکی، نماز، وضو، تیمم کی فرمائش ادھ کٹے لفظوں کے ساتھ ہاتھ کے اشاروں کے ساتھ برابر جاری۔ ہاتھ اٹھاتی ہیں کانوں تک لے جاتی ہیں پھر سینے تک لے آتی ہیں گویا نماز پڑھے چلی جاتی ہیں! — اللہ کے کلام والذین ہم فی صلاتہم دائمون کی تفسیر کتابوں اور روایتوں کی مدد کے بغیر ایک نئے رنگ میں ظاہر ہو رہی ہے۔

اللہ کی بندی کا سابقہ اپنے مولیٰ سے تھا بیٹے اور پوتے پاس کھڑے پکار رہے ہیں بلا رہے کوئی جواب نہیں ملتا! یا اللہ اتنی بے رخی تو زندگی میں کبھی نہیں دیکھی چہرہ دھلے کپڑے کی طرح یک بخت سفید خون کی چھینٹ نام کو نہیں بس نور ہی نور حالت منٹ منٹ پر کچھ سے کچھ ہونے لگی تنفس تیز سے تیز تر ہو گیا، نبض کا نظام بگڑ گیا، آنکھ کی پتلیاں ختم کر رہ گئیں ناسوت کے رشتے ٹوٹنے لگے برزخ کے دریچے کھلنے لگے حلق نے دوا پانی سب سے انکار کر دیا بجز آب زمزم کے اللہ کی کریمی کے قربان کہ اس کے قطرے آخری وقت بھی اتر گئے، چارپائی قبلہ رخ رکھدی گئی ہاتھ پیر برابر کر دیئے گئے اس نامرسا نے سورۂ یاسین آخری بار پڑھنی شروع کی جب آیۂ کریمہ سلام قولاً من رب الرحیم آئی

جی نہ مانا بار بار اس کی تکرار کان کے خوب قریب جا کو کی ادھر زبان پر فسبحان الذی بیدہ ملکوت کل شیئ و الیہ ترجعون آیا ادھر روح پرواز کر گئی ۔ گویا اسے انتظار اسی بشارت کا تھا ۔ !

موت کے کچھ دیر بعد ہاتھ میں نے چھو کر دیکھے انگلیاں اب تک نرم تھیں یہ وہی ہاتھ ہیں جو داد و دہش میں کیسے کھلے ہوئے تھے اور عبادت کے وقت کیسے بندھے رہتے تھے ۔ زمزم میں ڈوبا ہوا کفن اسی گھڑی کے انتظار میں ۲۹ برس سے ساتھ ساتھ پھر رہا تھا آج کام آیا غسل بیٹی بہو اور پوتیوں نے ل کر دیا پردے کے باہر سے ہم لوگ ہدایت دیتے رہے اور لوٹوں میں پانی بھر بھر کر دیتے رہے غسل و کفن کے بعد نعش ایک آرام دہ موٹر لاری پر وطن لائے دفن کے لئے جگہ خاندانی مسجد سے بالکل متصل ملی ۔ اللہ کی بندی تیری عمر بھر کی آرزو پوری ہوئی ۔ اذان کی آواز کے ساتھ تجھے عشق تھا اب جی بھر کر یہ آواز قیامت تک سنے جا ۔ !

نماز جنازہ اسی نامہ سیاہ نے پڑھائی جنازہ میں جو کچھ پڑھا جاتا ہے سب کو معلوم ان اذکار کے ساتھ ساتھ زیر لب تقریباً یہ مناجات بھی جاری رہی ۔ اے مالک مولی آج تیرے حضور میں وہ بندی آرہی ہے جس نے ۵۰ سال کی عمر تک روزہ حتی الامکان ایک قضا نہیں ہونے دیا نماز ایک وقت کی بھی ناغہ نہ ہونے دی تیری مخلوق سے محبت کرتی رہی خود بعد کو کھایا دوسروں کو پہلے کھلایا جو پایا اس میں دوسروں کو شریک کیا مئی جون کی لپٹ اور تپش میں روزے رکھے دسمبر جنوری کی کڑکڑاتی راتوں میں اٹھ کر نماز پڑھی عزیزوں کی غریبوں کی بستی والوں کی غمخوار رہی تیرے نام کی عاشق تیرے رسولؐ کے نام کی دیوانی تھی میں گواہی دیتا ہوں کہ اس نے میرے ساتھ دنیا میں جو آخری کلام کیا وہ تیرے ہی کلام کے پڑھنے کا حکم تھا آج ہوا ئیں اس کے نام پر ماتم کر رہی ہیں اور یتیم

اس کے لئے سر پیٹ رہے ہیں اس کی موت اس مہینے میں آئی جو تیرے رسول برحق کی وفات کا
مہینہ ہے اس وقت آئی جب شب دوشنبہ شروع ہو چکی تھی اس مرض (بخار) میں ہوئی جس میں
تیرے رسولؐ نے موت کی شہادت پائی ہے پھر پردیس میں ہوئی جو تیری رحمت کو جوش میں لانے
کا ایک ذریعہ ہے ابدی نیند کی جگہ اس نے ڈھونڈھ کر تیرے گھر کے جوار میں پائی تاکہ تیرا نام
اس کے کانوں میں پڑتا رہے تیری رحمت تو کسی سہارے کی کسی بہانے کی محتاج نہیں اور پھر
اس کے لئے تو اتنے بہانے موجود ہیں اے کریم و شفیق آقا اس کی لغزشوں سے درگزر
کیجیو اس کی خطاؤں پر خط عفو پھیر دیجیو اس کے حسنات کو بڑھائیو اور اس کے ساتھ وہ معاملہ
کیجیو جو شایان شان ہے تیری رحمت کے تیری صفت ستاری کے تیری صفت غفاری کے۔

نازبردار بھائی

حقیقی بھائی میرے ایک ہی تھے سن میں مجھ سے آٹھ سال بڑے نام عبدالمجید
[illegible]ل ولادت غالباً آخر ۱۸۸۳ء۔

محیت النفس کا روگ بچپن ہی سے لگ گیا تھا تعلیمی ترقی پوری تیزی سے نہ کر سکے
[illegible]ت کے شریف مسلمان گھرانوں کے دستور کے مطابق پہلے قرآن مجید ختم کیا پھر اردو فارسی بھی خا[illegible]
[illegible]ی اور عربی کی بھی بقدر ضرورت تحصیل کر لی یعنی نحو کافیہ تک اور منطق کے ابتدائی رسالے صغریٰ
[illegible]ی وغیرہ۔ انگریزی تعلیم لکھنؤ کے کیننگ کالج اور کرسچین کالج میں انٹرمیڈیٹ تک حاصل
[illegible] اور خیال رہے کہ انٹرمیڈیٹ کا مرتبہ آج سے ۵۰ سال قبل وہی تھا جو اب ایم اے
[illegible]ہے۔ سرکاری ملازمت شروع نائب تحصیلداری سے کی اور جلد ہی تحصیلدار ہو گئے۔۔ اور
[illegible]حصیلداری بھی خاص شہر لکھنؤ کی ملی ۱۹۲۴ء میں جب ڈپٹی کلکٹر ہوئے اور اس عہدہ
[illegible]ھنؤ، گونڈہ، بستی، سہارنپور، سیتاپور، بہرائچ فیض آباد وغیرہ مختلف شہروں میں رہ کر
[illegible]ن لکھنؤ ہی کی ایڈیشنل سٹی مجسٹریٹی سے ۱۹۴۲ء میں لی اور اس کے بعد بھی دو ایک
[illegible]ل راشننگ افیسر وغیرہ رہے۔

نیک مزاجی، صلح جوئی، بے طمعی، فقیر دوستی والد مرحوم سے ورثہ میں پائی تھی۔ ابتدا
[illegible]مدت سے آخر عمر تک قائم رہی۔ سرکاری عہدہ پر رہ کر اچھے اچھوں کی سیرت دگرگوں

۱۵ر جنوری ۱۹۵۰ء

کی قلعی کھل جاتی ہے پھر جگہ نیک نام اور ہر دلعزیز ہی رہے حکومت سے کام لینے کے بجائے ہر ایک سے بچ کرتے اور گھل مل کر رہے۔ اور دوستی ہی دوستی میں سارے کام انجام دیتے رہے لکھنؤ کی تحصیلداری یوں بھی بڑے معرکے کی چیز ہے کلکٹر صاحب کمشنر صاحب یہاں تک کہ لاٹ صاحب کے آل بھی عجیب وغریب فرمائشوں کا نزول روز ہی ہوتا رہتا تھا۔ اور پھر تحریک خلافت و ترک موالات کا زمانہ تو غضب کا زمانہ تھا۔ اتنی کڑی منزل بھی اپنی مروت اور دوستانے کے قدموں سے طے کر گئے ______ سیاسی لیڈروں میں تعلقات محمد علی، حسرت موہانی، رفیع احمد قدوائی وغیرہ سے اچھے خاصے اور ایک حد تک مولانا ابو الکلام آزاد سے بھی رہے اور مقامی ہندو لیڈر دل پنڈت ہرکرن ناتھ مصر وغیرہ سے رہے۔ خود کتب بینی اور اخبار بینی کے عاشق تھے اس لئے گہرے تعلقات نیاز مندی کے اکثر علما، وقت مثلاً مولانا شبلی، مولانا تھانوی، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا گیلانی، مولانا عبدالباری فرنگی محلی، مولانا محمد زکریا سہارنپوری ادیبوں، شاعروں میں اکبر الہ آبادی، ریاض خیرآبادی، اثر لکھنوی، سید جالب، کشن پرشاد کول، آنند نرائن ملا، مہدی افادی، وغیرہم سے رکھے۔ اور بعض سے تو خاصی بےتکلفی قائم تھی۔ مولانا شبلی اور ندوہ والوں سے خصوصی ربط تھا۔ اور قیام سہارنپور کے زمانہ میں حضرت تھانوی کی خدمت میں بار بار حاضر ہوتے تھے۔ فرنگی محل سے تعلقات تو خاندانی اور مثل عزیزوں کے تھے۔

پنشن کے بعد اپنے کو گویا خدمت خلق کے لئے وقف کر دیا تھا۔ اور کنبہ اور برادری والوں کے حق میں تو ایک آیۂ رحمت تھے علاوہ اپنی حسب حیثیت مالی امداد کے ہر ایک کے لئے دوڑ دھوپ سعی و سفارش میں آگے آگے اور اس میں نہ اپنی صحت کو دیکھیں نہ گرمی، سردی، موسم کی کسی سختی کی پروا کریں۔ انجمن ترقی اردو، انجمن اصلاح المسلمین مدرسہ قدیمہ فرنگی محل، دار العلوم ندوہ، تعلیم گاہ نسواں مسلم گرلز کالج خدا معلوم کتنے

تعلیمی و رفاہی اداروں کے ایک کارگزار و فعال ممبر بلکہ اکثر کے عہدہ دار بھی ورکن ایک ہندو یتیم خانہ کمیٹی کے بھی تھے اکام ہر ایک کا کسی کی مروت یا دباؤ میں نہیں اپنے ذاتی ذوق و شوق سے انجام دیتے تھے۔

اپنے معمولات و نظام اوقات کے بڑے پابند تھے منھ اندھیرے اٹھتے اور فجر اول وقت پڑھ کر ٹہلنے نکل جاتے اور کئی میل کا لمبا گشت لگا کر واپس آتے۔ دو چار سال تک مکدر ہلانے کے بھی عادی رہے۔ بعد نماز ظہر ایک پارہ کی تلاوت کرتے اور اب کئی سال سے ہاتھ میں تسبیح لئے اوراد میں بھی مشغول رہتے لاغر اور ضعیف الجثہ اور دمہ کے مریض ہونے کے باوجود ان پابندیوں پر اتنی مستعدی حیرت انگیز تھی۔ ———
اُردو اشعار تو بہ کثرت یاد تھے اور کچھ فارسی کے بھی۔ شبلی۔ اکبر۔ اقبال۔ ظفر علی خاں۔ محمد علی جوہر کے کلام کے اچھے خاصہ حصے کے حافظ تھے۔

خیر دنیا کے لئے جیسے بھی ہوں اپنے اس تند خو بھائی کے حق میں تو سراپا شفقت و کرم اور پیکر لطف و احسان ہی تھے اپنی اور بیوی بچوں کی ہر خوشی میری خوشی کے آگے گرد کر رکھی تھی۔ جب تک پنشن نہ ہوئی اور میں نے قبول کرنے سے قطعی انکار نہ کر دیا برابر ایک معقول رقم سے میری مالی امداد کرتے رہتے اور اب تک میں ور یا! ویسے لکھنؤ جب کبھی جاتا تو ان کے یہاں ایک چھوٹی سی عید ہو جاتی پر تکلف کھانے اور ہر طرح کی خاطریں اور واپسی میں ناشتہ کے نام سے کچھ نہ کچھ تحفے ساتھ کر دیتے ضرور رہتے خط میں کسی ہفتہ ناغہ نہیں ہوتا بلکہ بار ہا تو خط ہفتہ کے اندر ہی پہونچ جاتا اور آم خربوزہ انگور آڑو و خوبانی وغیرہ ہر ہفتہ لکھنؤ سے کوئی موسمی پھل پہنچتے رہنے لازمی۔ سن میں اتنا بڑا ہونے کے باوجود برتاؤ میں کہیں سے بھی بڑائی کا پتہ نہ چلنے دیتے بلکہ صاحب سلامت تک میں اکثر خود ہی سبقت کر جاتے۔ خاندان بلکہ برادری بھر میں ہم لوگوں کی محبت ایک مثالی حیثیت اختیار کر گئی تھی ——— محبت مجھے بھی تھی لیکن وہی جیسی ایک بھائی کو دوسرے سے

ہوتی ہے ان کی محبت اس سے کہیں بڑھ کر بیدرانہ بلکہ ادرانہ شان رکھے ہوئے تھی میری ناخوشی انھیں کسی حال میں گوارا ہی نہ تھی۔ بھائی بہت سے دیکھے ہیں لیکن ایسا نازبردار بھائی کم ہی کسی کے نصیب میں آتا ہے۔

اتنی طویل مدت میں ایسا نہ تھا کوئی سیاسی مذہبی یا خانگی اختلافی مسئلہ ہی نہ آیا ہو۔ کیوں نہیں اس دنیا میں ان طویل سالقوں کے بعد یہ ممکن کیوں کر تھا۔ بارہا اس کی نوبت آئی لیکن محبت کے غلبہ نے کبھی اسے دیر تک ٹھہرنے کی اجازت نہ دی۔ بھائی ہونے کے علاوہ ان کے چاروں لڑکوں کی شادیاں میری ہی چاروں لڑکیوں سے ہوئیں ہر صاحب تجربہ جانتا ہے کہ اس جوہرے سمدھیانے نے تعلقات کو کتنا نازک بنا دیا ہوگا لیکن یہ محض ان کی عاشقانہ محبت کا کرشمہ تھا کہ شیشہ میں بال پڑنے کی بھی نوبت کبھی نہ آئی۔

اپنی لڑکی کی شادی تو تمام تر میری ہی رائے اور مرضی کے ماتحت کی۔ ہر لڑکے کی تعلیم و تربیت میں میرے مشورے کو مقدم رکھا۔ اور بڑے اور ہونہار لڑکے کو بجائے کسی امتحان بقایا مجھ دقیانوسی کے انگنے پر سپرد کر دیا۔ حفظ قرآن اور اس کے بعد طب اور مشرقی امتحانات کون دوسرا ڈپٹی کلکٹر اسے گوارا کرے گے ـــ اپنے ہم سروں کے سامنے اپنے کو کیا بنائے گا۔

۱۷ دسمبر (دوشنبہ) کو انھیں اچھا خاصہ چھوڑ کر دوپہر کی گاڑی سے میں دریاباد واپس آیا۔ حسب معمول خدا حافظ کہہ کر مجھے رخصت کیا (کل جانتا تھا کہ اس عالم ناسوت میں ان کی زبان سے یہ بالکل آخری لفظ میرے کان میں پڑیں گے؟) شب تک اپنے معمولات، دزمرہ کے مطابق پورے ہوا کیے۔ ایک پاکستانی عزیز رخصت ہونے آئے۔ آٹھ بجے تک ان سے گفتگو رکی۔ نو بجے حسب معمول سونے لیٹے ۱۱½ بجے شب کو متصل لیٹے ہوئے منجھلے لڑکے کو اٹھا کر کہا اس وقت سانس کی تکلیف زیادہ ہے۔ اس کے بعد کہا "یا اللہ رحم"۔ لفظ اللہ کو تکلیف کی حالت میں خوب کھینچ کر ادا کرتے تھے۔ انھوں نے دوا پلائی اس کے بعد نیم بیہوشی کی حالت

حکیم عبدالقوی حبیب احمد

میں تکیہ پر سر رکھ کر لیٹ گئے۔ یہ سمجھے کہ شاید سو گئے جب کچھ منٹ تک کراہنے اور سانس لینے کی آواز نہ آئی تو انھیں فکر ہوئی اور انہوں نے جا کر اپنے بڑے بھائی حکیم عبدالقوی کو جگایا۔ انھوں نے آکر دیکھا تو نبض ڈوب چکی تھی۔ بل جل بچ گئی۔ دوسرے لوگوں نے بھی آکر دیکھا۔ ایک دوسرے طبیب کو بھی بلا کر دکھایا گیا۔ وہاں اب کیا تھا۔ بندہ اپنے مولی کے پاس پہنچ چکا تھا عبدالمجید اپنے رب مجید کے حضور میں حاضر ہو چکا تھا آخری چیز مرحوم کے جسم میں جو پہونچی وہ آب زمزم کے چند قطرے خمیرہ گاؤزبان عنبری جواہر والا کے ساتھ تھے۔ اس کی رحمت بے حساب سے کیا عجیب ہے کہ نزع کی تکلیفیں نہ ظاہر ہونے اور سکرات کے جھٹکے نہ لگنے سے والناشطات نشطا کا وعدہ ان کے حق میں پورا ہو چکا ہو!

اطلاع ہونے پر دوپہر کو جب میں پہونچا تو اسی ڈرائنگ روم میں جہاں آرام کرسی پر بیٹھے ہوئے اس نازبردار بھائی کا چہرہ باوجود بیمار بزار ہونے کے ہمیشہ مجھے دیکھتے ہی کھل اٹھتا تھا۔ آہ وہ پلنگڑی پر نہایا دھویا ہوا کفن پوش ——— خاموش لیٹا ہوا ہے۔ آج میری طرف سے یہ بے التفاتی یہ بے اعتنائی چہرہ اب بھی پر رونق۔ بلکہ ایک حد تک نورانیت لئے ہوئے آنکھ کھلی تھی ——— تو کلمہ شہادت کی آواز جلد سے جلد کان میں ڈالی گئی تھی آج آنکھ بند ہوئی تو کمرے کے در و دیوار اسی اللہ کے نام اور اسی رسول کے برحق ہونے کی شہادتوں سے گونج رہے تھے!

صحن میں مجمع دیکھا تو توقع سے بڑھ کر۔ اطلاع پوری طرح نہ ہو سکنے کے باوجود کیسے کیسے اہل علم و عمل موجود تھے۔ ایک طرف فرنگی محل کے جمال میاں سلمہ، مولانا محمد عتیق و ناصر میاں بکر العلوی وغیرہم دوسری طرف حضرات ندوہ مولانا محمد منظور نعمانی (شیخ الحدیث) مولانا محمد اویس نگرامی (شیخ التفسیر) و مولانا ابوالعرفان وغیرہم۔ تیسری طرف مولانا عبدالباری ندوی، ڈاکٹر محمد یوسف حسین خاں (پرو وائس چانسلر علی گڑھ)، اور حاجی صدیق حسن صاحب (ممبر بورڈ آف ریونیو) وغیرہ۔ حکیم اسی جماعت کو نماز پڑھانے کا اور ریحان

مشار علاوہ دعائے مسنون کے تحت الشعور اور زیر لب کچھ اس طرح عرض و معروض کرتا رہا کہ اے مالک و مولیٰ تیرے سچے پیام لانے والے نے یہ بتایا ہے کہ تو اس پر رحم کرتا ہے جو تیرے بندوں پر رحم کرتا ہے تو اپنے اس نرم مزاج و رحم دل بندے کے ساتھ بھی معاملہ رحم و کرم کا کر اور اس کی ساری لغزشوں اور کوتاہیوں کو اپنی مغفرت کے پردے میں چھپا دے ——— !

ڈھائی بجے کے بعد جنازہ اٹھا اور راہ میں صدہا مومنین نے کاندھا بدلتے ہوئے عیش باغ کے مشہور قبرستان ..... میں پہونچا دیا گیا۔ اور وہاں کچھ مزید مخلصین بھی پہونچ گئے! اللہ ان سب کو جزائے خیر دے اور سیکڑوں غمخوار دل کو جنھوں نے خود آکر یا خط کے ذریعے تعزیت فرمائی ہے ——— اور اب باقی حضرات سے عرض ہے کہ جو کچھ کہنا ہو مرحوم کے حق میں اپنے رب ہی کہیں سنیں۔ ہر علمی کام کے لئے بڑی ضرورت خانگی سکون کی ہوتی ہے۔ اور میں شہادت دیتا ہوں کہ میری خانگی زندگی کے سکون میں بڑا دخل میرے اس مرحوم و ناز بردار بھائی کو تھا۔

ہمشیر کی رخصتی

ہمشیر ایک ہی تھیں، سن میں ۴۔ ۵ سال بڑی عمر میں ۶۰ سال کے اندر۔ عابدہ اور صالحہ ایسی کہ دور دور تک مثال ذرا مشکل ہی سے ملے گی۔ عابدہ تہجد گزار، نماز تلاوت کی عاشق غیبت و بدگوئی لڑائی جھگڑے سے ناآشنا۔ ایک ایک کی ہمدرد و غمخوار۔ ۲۵ سال کی عمر میں بیوہ ہو گئیں تھیں اولاد کوئی نہ تھی۔ وسط اپریل میں لکھنؤ میں بیمار پڑیں اور بیماری کے وہ شدائد کہ الاماں وہ تیمارداری کی راتیں، کبھی مایوسی کی تاریکیاں کبھی امید کی ہلکی سی شعاعیں۔ ابھی قرآن مجید پڑھ کر سنایا جا رہا ہے، دور دور دعائیں مانگی جا رہی ہیں اور ابھی غفلت پھر امیدوں کے سراب دکھانے لگی! پورے ایک ہفتہ موت و حیات کی کشمکش میں گزرا۔ سورہ یٰسین دن میں کئی بار پڑھی جاتی رہی اور دوا سے زیادہ استعمال آب زمزم اور شہد کا رہا۔ اپریل ۱۹۶۵ء کی ۲۰ تاریخ اور جمادی الاولیٰ کی ۱۸ کو دوپہر کے وقت تقدیر کا نوشتہ پورا ہوا اور جو صابرہ و شاکرہ بندی شاید جنت ہی کے لئے بنی تھی جنت کے سفر پر روانہ ہو گئی۔ کم نصیب ناکارہ سورہ یٰسین پڑھ رہا تھا اور ایک جوان صالح منہ میں آب زمزم ٹپکا رہا تھا۔ گزرنے والی کی پیشانی پر پسینہ کے قطرے دیکھے گئے اور گرو رونے کی بے اختیار آوازوں اور سسکیوں کے ساتھ کلمہ شہادت کی صداؤں سے گونج اٹھا! ــــ موت شاید ہر مومنہ کی یوں ہی ہوتی ہے! غسل کے بعد چہرہ پر رونق تھی، معصومیت تھی، کوئی اثر نہ ضعف کا نہ مرض کے شدائد کا! ــ ایسا پر رونق و شاداب چہرہ تھا شاید دائرہ شباب میں ۳۰۔ ۳۵ سال قبل رہا ہوگا! نماز جنازہ لکھنؤ کے مشہور عارف باللہ حاجی محمد شفیع صاحب بجنوری نے پڑھائی، کئی دن قبل سے دعاؤں

سن لکھنؤ ۱۹۶۵ء

میں بھی لگے ہوئے تھے۔ جماعت میں شریک مولانا محمد اسلم فرنگی محلی مولانا عبدالباری ندوی خلیفہ
مجاز حضرت تھانویؒ، مولانا محمد عمران خاں ندوی اور دوسرے صالحین تھے۔ مولانا محمد شفیع فرنگی
محلی اور دوسرے حضرات بعد کو پہونچے۔ تدفین بعد مغرب مشہور گورستان عیش باغ کے نئے
چمن میں ہوئی۔ شب دوشنبہ شروع ہو چکی تھی، قبر میں یہ نامہ سیاہ اپنی عمر میں پہلی بار اترا اور
جس نے عمر بھر ان کے بہن ہونے کے حقوق ادا کئے تھے اور سن میں بڑا ہونے کے ناطے اس نے عالم ناسوت
کی یہ آخری خدمت اپنے ہاتھ سے انجام دی! — سن میں بڑی تھیں، مگر ساری عمر اپنے کو چھوٹا
بنا کر رکھا تھا۔ آج اپنے پروردگار کے حضور میں ان شاء اللہ ہر طرح بڑائی کے صلہ سے سرفراز
رہی ہوں گی!

ماں کی خالص، بے غرض و بے لوث محبت کا اگر کہیں نشان ملتا ہے تو بہن ہی کی ذات
میں۔ ہر بہن رکھنے والا اس کا تجربہ رکھتا ہے۔ اللہ نے آج وہ نعمت واپس لے لی! قسمت کا حق
اتنے دنوں کب ادا ہوا تھا جو اب کبھی آئندہ اس کی امیدیں قائم کی جائیں۔ — ہمیشہ کی
رخصتی ایک شادی کے وقت ہوتی ہے اور ایک یہ۔ وہ مجاز اور یہ حقیقت!

عقلاً صبر، بلکہ معنیً تسلیم و رضا داخل ایمان ہے، لیکن طبعی حزن و غم پر بس نہیں۔ زندگی
میں جو نقش خلا پیدا ہو گیا ہے، وہ زندگی بھر کے لئے ہے۔ صدق کے پڑھنے والے بھائی اور بہن
اگر کوئی ہمدردی محسوس کریں تو بجائے تعزیت نامہ پر وقت صرف کرنے کے، دعا ہی اپنی جگہ دعائے
خیر فرمائیں اور اگر ہو سکے تو کچھ قرآن پاک بقدر سہل آسانی سے پڑھ سکیں مرحومہ کو بخش دیں
غم اور طبعی غم میں ہم آخرت نے لذت بھی بالکل رکھ دی! اور قلب کی قساوت کا تو اس غم
سے بڑھ کر کوئی علاج ہی نہیں، کاش اسی کے اثرات میں پائیداری ہوتی! — محبوب حقیقی کی حکمت
ہے، اور جمال میں کمال، کہ نعمت دیتے ہیں تو ہنسا کر، اور عارضی طور پر واپس لیتے ہیں تو رلا کر
جسم کی لذت اس میں، روح کی حلاوت اس میں!

بوڑھی محبوبہ[1]

۱ شوال یوم سہ شنبہ تھا اور جنوری ۱۹۶۹ء کی پہلی تاریخ کہ ۱۲½ بجے شب کے بعد ایک مومن بندی کی روح ۱۰ اور ۷۰ سال کی عمر میں اپنے مالک و مولی کے حضور طلب کر لی گئی جیسی کہ بے شمار روحیں ہر لمحہ وہر آن طلب ہوتی رہتی ہیں۔ لیغفر اللہ لنا ولہا یرحمنا و یرحمہا. یا ارحم الراحمین۔ اللہ اس کے موجودہ مسکن کو جنت کے پھولوں سے بھر دے اور اسے جنت ہی کا ایک چمن بنا دے۔

جون ۱۹۱۲ء میں اس تباہ کار کے عقد ازدواج میں آئی تھی۔ ۵۲ سال کی مدت رفاقت کچھ تھوڑی نہیں ہوتی جبکہ رفاقت محض رسم وضابطہ کی نہ ہو بلکہ اس کی بنیادیں الفت ومحبت پر قائم ہوئی ہوں! — پیمان وفا عمر بھر کا تھا لیکن خود عمر کی پائداری کتنی ہے؟

عمر بھر کا تو نے پیمان وفا باندھا تو کیا
عمر کو بھی تو نہیں ہے پائداری ہائے ہائے

شادی جس وقت ہوئی طرفین ۵۰، ۷ برس کے بوڑھے کھوسٹ نہ تھے۔ ایک طرف شوخ قبول صورت نوجوان لڑکی تھی ۲۰-۲۱ سال کی عمر کی اور وقت کے معیار سے خاصی پڑھی لکھی۔ انگریزی کی شد بد سے واقف۔ اور لکھنؤ کے اونچے معاشرے کی تربیت یافتہ اور دوسری

---

[1] منقول از صدق جدید ۱۰ جنوری ۱۹۶۹ء

طرن ۲۴ سالہ نوجوان انگریزیت میں غرق دین و مذہب کے نام سے بیزار عقلیت و ریشنلزم کا پرستار لڑکی کہیں باہر کی نہیں اپنے خاندان ہی کی تھی حقیقی خالہ کی پوتی رسم و رواج خاندان کے برخلاف اسے شوق اور چاؤ کے ساتھ خواستگاری کرکے لائے والا مثنیٰ تاؤ نیم اسلامی حیاداری کے حدود کے اندر رہ کر راہ و رسم دنیا محبوبی کے قدم ایک ایک کرکے اٹھتے رہے تاآنکہ شوہر کو دو چار سال بعد از سر نو سعادت اسلام نصیب ہوئی دونوں نے ۱۹۲۹ء میں مل کر حج کیا اور آخر سن کے تقاضے سے وہ وقت بھی آگیا جب زلفوں کی سیاہی سفیدی میں تبدیل ہوگئی دانتوں کی جمی ہوئی لڑی ساری ایک ایک کرکے بکھر گئی۔ چہرے پر جھریوں کی لدھیاں پڑگئیں۔ قد و قامت میں کوئی شائبہ رعنائی کا باقی نہ رہا حسن و جمال کی جگہ صرف نور عصمت کی جگمگاہٹ باقی رہ گئی!

ہے حقیقت مجاز اب یہ کھلا ہے حیا کے راز
سب ہے فریب آب و گل حسن و جمال کچھ نہیں

مسلسل اور متعدد بیماریوں نے معذور اور تقریباً فرلیش بنا ڈالا۔

میں نوائے سوختہ در گلو تو پریدہ رنگ رمیدہ بو
میں حکایت غم آرزو تو حدیث ماتم دلبری

اس پر بھی اس رشتۂ محبوبیت میں بحمداللہ ذرا بھی فرق نہ آیا! ——— اور بدبخت شاعر اور افسانہ نویس حقیقت حال سے منزلوں دور اور بیگانہ ہیں جنھوں نے الفت و محبت کے کرشموں کو صرف جوانی کے چند برسوں تک محدود رکھا ہے۔

اول ہاتھ میں لینے والی چیز حسن صورت نہیں حسن سیرت ہوتی ہے اور اللہ کے اس دولت سے حصہ وافر دیا تھا عورت کا جوہر سسرال والوں کی خدمت کرنا ہے اس مرحومہ نے یہاں آتے ہی میری والدہ اور ہمشیرہ کا دل اپنے ہاتھ میں لے لیا جو خاندان بھر کا

ہلا تا ہے اس میں آپس کے سابقہ کی الجھنیں اور زیادہ ہوتی ہیں۔ یہاں میرے بھائی او
مباورج دونوں اس سے رام ہوگئے۔ خاندان کے دوسرے عزیز و اقارب ملنے والوں
کی خادماؤں سب پر اس نیک بخت کی میٹھی زبان خوش مزاجی، فیاض طبعی نے اپنا سکہ جما لیا
تھا۔ داد و دہش و غریب پروری داخل فطرت تھی۔ ابتدائی ماحول اہل رسوم و بدعات کے
درمیان رہا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ رفتہ رفتہ حضرت تھانوی سے قرب بڑھا عقیدت بڑھتا ہی گیا اور
بیسیوں تمام مخلص بزرگوں مولانا گیلانی اور سید سلیمان ندوی اور علی الندوی وغیرہم کے خیالات سے
ستفادے کے پورے موقع ملتے رہے۔ نماز کی تارک شروع میں بھی نہ تھیں کچھ روز میں پوری
پابند ہوگئیں۔ روزے جب تک قوت باقی رہی پابندی سے رکھتی رہیں۔ آخر عمر میں فدیہ
ضابطہ دیتی رہی تھیں۔ ۔ ۔ مسلمانان عالم کی فلاح و بہبود کے لئے دل میں تڑپ تھی ـــ
دہ ہی کے ایک خاندان نے اپنا وطن شہر باندا دو تین پشتیں قبل بنا لیا تھا وہی میکہ تھا۔
س کی محبت دل میں رچی بسی ہوئی تھی۔

ماں بڑی عابدہ پائی تھیں دہ وہیں دفن تھیں بڑی تمنا ان ہی کے پہلو میں دفن ہونے
کی تھی۔ بھائی رخان بہادر مسعود الزماں بیرسٹر اور نائب صدر یوپی کونسل مرحوم) کی دو پوتیوں
شادی باندے میں ۲۹ دسمبر کو طے پائی، شروع رمضان میں وہیں چلی گئیں۔ عید سالہا
ل کے بعد وہیں کی۔ شادی کے بعد دو ایک ہفتہ وہیں قیام کا ارادہ تھا کہ پہلی اور دوسری
ری کی درمیانی شب میں بلاوا وطن حقیقی سے آگیا اور مسبب الاسباب نے گورستان
ا ہی دفن ہونے کا سامان یوں بہم پہونچا دیا۔ دعا یوں قبول ہوتی ہے ایک بڑی آرزو
ب جمعہ پانے کی تھی تو وفات کے لئے تو نہیں لیکن تدفین کے لئے شب جمعہ ہی نصیب
ئی ـ

۴۲ سال کی طویل رفاقت میں جدائی کا اتفاق کبھی بھی تین چار ہفتوں سے زیادہ
ہوا۔ ہمیشہ کہنا چاہئے کہ یکجائی ہی رہی۔ اب کی نادر (آخری) روانگی جب باندے کے لئے

۱۶ ر رمضان (۵ دسمبر) کو اختیار کرنے لگیں تو اپنے ساتھ وہ کفن بڑے اہتمام سے سامان میں رکھ لیا جو سالہا سال سے آب زمزم میں تر کیا ہوا محفوظ تھا۔ ایک مخلص نے مکہ معظمہ سے مجھے خانہ کعبہ کی چھت کے کچھ ٹکڑے بطور تبرک بھجوا دیئے تھے ان میں سے بھی ایک ٹکڑا اپنے ہمراہ رکھ لیا۔ پہلی اور دوسری جنوری کی درمیانی شب میں ۱۱ بجے تک جاگتی بیٹھی باتیں کرتی رہیں۔ میری بڑی لڑکی ہمراہ تھی اور انگیٹھی کے گرد بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے میری زبان سے کبھی سنا ہوا قصہ بیان کیا۔ — قاضی یحییٰ بن اکثم تیسری صدی ہجری کے شروع کے بزرگوں میں گزرے ہیں صحیح بخاری کی راویوں میں ہے۔ ان کی وفات پر ان کے ایک معاصر نے انھیں خواب میں دیکھا اور حسب توقع اچھی حالت میں دیکھا پوچھا کیا ماجرا گزرا انھوں نے فرمایا کہ قبل اس کے کہ کوئی سخت سوال یا جرح مجھ سے شروع ہو، میں با اطمینان تمام مسکرایا۔ سوال ہوا کہ عین سوال و جواب کے موقع پر یہ تبسم کیسا؟ میں نے عرض کیا مجھ سے حدیث بیان کی فلاں فلاں نے اور اس نے فلاں صحابی سے اور اس نے رسول اللہ سے۔ اور آپ نے فرشتہ جبریل سے اور انہوں نے تجھ ..... تبارک و تعالیٰ سے کہ مجھے بوڑھے مومن سے جرح کرتے مروت مانع آتی ہے۔ اور میں سفید بال لے کر تو بہر حال آیا ہوں۔ بس کرم سے مجھے اطمینان ہے۔ اس پر معاً جواب ارشاد ہوا کہ سچ کہا جبریل نے اور سچ کہا ہمارے رسول نے اور سچ کہا ان صحابی اور فلاں فلاں راویوں نے بے شک اسی پیرانہ سالی پر مغفرت ہوئی جاتی ہے۔

یہ روایت میں نے کبھی حضرت تھانوی کی زبان سے سنی تھی اردو ایک جزئیات جو کچھ بھی فرق ہو گیا ہو ...... حکایت سن کر اُدھر بھی سننے والیاں متاثر ہوئیں ادھر اللہ کی بندہ نوازی۔

لاشعوری طور پر بشارت کا یہ منظر پیش آ جانے سے کوئی گھنٹہ ہی ڈیڑھ گھنٹہ کوئی سواباره بجے مرحومہ کو سوء تنفس (سانس پھولنے) کی شکایت پیدا ہوئی ادھر

سب میں اکثر پیدا ہو جایا کرتی تھی۔ لڑکی کو جگا کر وہ دوا استعمال کی جو ایسے موقع پر نفع کر جایا کرتی تھی۔ آج نفع نہ ہوا۔

بہنیں اور بھتیجیاں وغیرہ سب بھاگ کر آ گئیں۔ ان کے حقیقی بھتیجے لکھنؤ میڈیکل کالج کے ایم۔ بی۔ بی۔ ایس۔ ڈاکٹر پاس ہی کے کمرے میں تھے اور گولیاں نکال کر انھوں نے چاہا کہ گولی ہاتھ میں لے کے اپنے حلق تک لیجائیں کہ معاً جس طرح نیند سے جھوم کر کوئی بیٹھا ہوا شخص گرنے لگتا ہے۔ یہ لیٹنے لگیں لڑکی نے اپنی گود میں لے لیا اور آناً فاناً روح قفس جسم خالی کر گئی۔ انھیں چند لمحوں کے اندر بغیر کسی خاص کش مکش کے! بدحواس نور نظر ڈاکٹر بھاگتا ہوا گیا اور دوڑتا ہوا انجکشن لا یا لگانا چاہا مگر تقدیر کے آگے سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ زبان بے بس یہ نکل سکا کہ اب دوا کا وقت گزر چکا ہے۔ ! ———— نزع و سکرات کے ان چند مختصر لمحوں میں ایک نہیں دو بار کلمۂ شہادت زبان سے ادا کیا۔ ایک بار خود سے کہا کہ دیکھو اب سانس میں کھٹک پیدا ہو گئی معاً بعد قبض روح پیشانی پر پسینے کے چند قطرے دیکھے گئے آخری دیدار جب کفن چہرہ سے سرکا کر کرایا گیا تو میرے علاوہ اور لوگوں کا بیان ہے کہ چہرہ قبلہ رو تھا چہرہ پر تسکین و بشاشت تھی آنکھیں بالکل بند تھیں ہونٹ بالکل بستہ ٹھوڑی ٹھیک پوری گولائی لئے ہوئے تھی رہا لانکہ دانت گر جانے کے بعد یہ قطع عموماً باقی نہیں رہ جاتی! اور ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم اور ہلکی سی سرخی تھی۔

---

۲ جنوری ۱۹۷۹ء (جمعرات) کو قریب شام ایک لاری ۵ ۲۔ ۳۰ مسافروں سے کھچری ہوئی لکھنؤ سے باندے جا رہی ہے اور اس وقت کانپور کے حدود میں داخل ہو رہی ہے سفر لمبا کچھ نہیں اتنی ہے جن لڑکیاں ہیں جو ابھی چند ہی گھنٹے قبل ماں کے سایہ سے محروم ہوئی ہیں اور جس کا جنازہ اپنی بچیوں کا انتظار کر رہا ہے۔ ایک ۷۵۔۷۶ سال کا بوڑھا ہے جو ابھی دنیا کی عزیز ترین متاع سے محروم ہو چکا ہے۔ اسی طرح چھوٹے بڑے

دوسرے عزیز و قریب ہیں کسی کی زبان پر کلمہ شہادت اور کسی کی زبان پر قرآن کی سورتیں اور اکثر کی آنکھوں سے آنسو رواں ہیں۔ وقت سوا پانچ سے گزر چکا ہے۔ آفتاب زرد پڑ چکا ہے اور ہر منٹ بلکہ ہر سکنڈ اور ڈوبتا ہی چلا جا رہا ہے ——— کھلے میدان میں جب کبھی غروب آفتاب کا منظر دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے دل ہمیشہ اس سے متاثر متاثر ہوا ہے۔ رفیقۂ زندگی ہی کے آخری لمحات حیات کا نقشہ نگاہوں کے سامنے کر دیا ہے آج یہ خیال نہیں واقعہ ہے۔ قال نہیں حال ہے۔ اپنی دنیوی زندگی کے لعلف و سکون و راحت کا آفتاب .... ڈوب رہا نہیں بلکہ واقعۃً ڈوب چکا ہے

۱۰½ بجے سب کو لٹا پٹا قافلہ باندے یوسف منزل کے پھاٹک پر پہونچا۔ اس ۵۲ سال کے عرصہ میں خدا جانے کتنی بار اس ڈیوڑھی پر قدم رکھنے کا اتفاق ہو چکا تھا۔ ہر بار اس سے کسدر جہ مختلف! آج کی آمد سب سے نرالی تھی۔ در و دیوار تک گویا رو رہے تھے کفن پوش جسم کو خاموش و ساکت ہوئے ۲۲ گھنٹے ہو چکے تھے۔ باندے لکھنؤ اور پھر دریاباد رابطہ قائم کرنے ہی میں ٹیلیفون اور تار دونوں کے ذریعے ۱۰ - ۱۲ گھنٹے لگ گئے تھے۔ باقی ۱۰ گھنٹے پہونچنے کی کوشش میں لگ گئے! ——— لاشۂ بے روح کو سامنے دیکھ کر کیا گزر رہی ہے یہ نہ پوچھئے۔ وہ وقت بہرحال یاد آگیا جب کسی بڑی سے بڑی خوش جمال و خوش صفات کا خاتون ذکر سننے میں آتا تھا اور طبیعت میں بجائے کسی قسم کے رشک کے ایک گونہ فخر و اطمینان ہی قائم رہتا تھا۔ بقول استاد شبلی ؎

یاد آں روزے کہ دست افشاں گزشتم از حرم
از غرورِ آں کہ من ہم آستاں داشتم!

نعمت بہرصورت فانی ہی تھی ——— اور دو ہی چار لمحہ کے بعد یہ صدا بلند ہوئی کہ ناسوت کی آخری زیارت ختم۔ بس اب آئندہ دیدار انشاء اللہ جنت ہی میں نصیب ہوگا!

———×———

زندگی میں جب کبھی بھی دفورِ اُنس وافراطِ تعلق پر نفس کو تنبیہ ہوتی تھی تو ذہن کے سامنے بنا
سے دنیا کے محتاط ترین، مقبول ترین، متوازن ترین، دانا ترین بشر کا اسوۂ حسنہ اماں عائشہؓ اور اماں
خدیجہؓ اور پھر کم وبیش اُمت کی دوسری ماؤں کے ساتھ آجاتا تھا اور آفتاب عالمتاب کے نور
کے آگے کسی صوفی کسی مجذوب، کسی راہب، کسی یوگی کی حقیقت کی ہستی ہی کیا تھی! ۔
اور اپنے زمانے کے مرشدِ کامل وہادیٔ سبل حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی نظیر بھی سامنے
تھی جب کبھی حضرت کے سامنے اپنا یہ حال رکھا جواب میں بکمال لاطفت یہی تسلی ارشاد
ہوئی کہ

خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

ور چھوٹے اگر بڑوں کے نقش سے تسکین ورہنمائی نہ حاصل کریں تو کیا کریں!

غرض یہ کہ جس وقت کے آنے کا دھڑکا سالہا سال سے ہر گھڑی لگا چلا آرہا تھا
وہ آخر اپنے وقت موعود پر آہی گیا۔ اور جس حیّ وقیوم نے صبر کا مطالبہ کیا۔ اسی نے گرتی ہوئی
قوت بھی صبر کی بخشدی! کارخانۂ کائنات میں ایک ذرّہ بھی فرق نہ آنے پایا اور دنیا جس
طرح چل رہی تھی۔ ٹھیک اُسی طرح چلتی رہی۔ کل شئی ھالک الا وجہہ اور کل من علیہا فان قسم
کے ارشادات بے معنی نہیں۔ سر تا سر بامعنی ہی تھے۔ ——— اپنے مخدوم بزرگ اور محترم
دوست مولانا سید سلیمان ندویؒ فاضل وعارف تھے۔ شاعر نہ تھے لیکن شعر بھی خوب کہہ
لیتے اپنی زوجہ ثانیہ سے کمال لطف والتفات رکھتے تھے۔ وفات پر مرثیہ کہا اس کے اس
شعر میں شاعری نہیں کی حقیقت کی ترجمانی کی ہے ؎

تیرے جانے سے گماں بر ہمی دہر کا تھا
تو گیا اور بپا دہر میں محشر نہ ہوا!

کسی بندہ کی خود یہ خام خیالی بھی کس درجہ طفلانہ ہو سکتی تھی! حدیث نبویؐ سرآپا

ہے کہ جسے ہم مسلمان اچھا کہیں اس کی مغفورت کی امید رکھو پھر جسے زبان ہی سے اچھا کہنے والے نہیں بلکہ جس پر آنکھوں سے آنسو بہانے والے ہم سے کئی گنے زیادہ بحمداللہ نکل آئے ہیں اس کے حق میں کسی کی شان غفاری سے کسی اغماض کا احتمال بھی آخر کیسے کیا جائے۔!

اے الہ العالمین! اس عفت شعار کی ناسوتی زندگی ختم ہوگئی۔ بندی اپنے پروردگار اور ہمدرد و رحمت و مالک کے حضور میں حاضر ہوگئی ہے کسی ظالم و جابر حاکم کے دربار میں نہیں ہے! تجھ سے بڑھ کر رحم و فضل کرنے والا اور کون ہے تو ہی سرچشمہ ساری مہر و بخشش کا ہے تیرے آگے سفارش و شفاعت کی زبان کہاں سے کھول سکتا ہوں صرف ایک چشم دید ہمہ وقت گواہ اور ویسے بھی بطور ایک عاجز و درماندہ بندے کے دو ایک گواہیاں عرض کئے دیتا ہوں۔

۱: جب یہ بیاہ کر آئی ہیں۔ یہ بہر حال مسلمان اور تھوڑی بہت پابند مذہب بھی بیتیں سنا ہے والی ہر کوشش مجھے مذہب کے دائرہ میں دوبارہ واپس لانے کی کر ڈالی اور ملّا حزم تصحیح عقائد کے بعد تجدید عقد ہو کر رہی۔

۲: اس وقت کے جاہلی رواج خاندانی کے ماتحت اس کے عقد کا مہر ۱۲۵ لاکھ اخرفیاں یعنی گھو کھا روپیہ قرار پایا تھا خود انھیں نے آگے چل کر مسائل سے واقفیت کے بعد اس رسمی و انسانوی تعداد کو گھٹاتے گھٹاتے پچاس یا چند ہزار روپیوں تک کے سوا سب معاف کر دیا تھا اور مہر کی رقم جبرے اس وقت کے حسب حیثیت بھی وہ معاً ادا کر دی گئی یہ کتنا بڑا احسان ان کا میری گردن پر رہا۔

۳: میرے قصد حج کے وقت بھی چند پر آمادہ ہوگئیں۔ بغیر مجھ سے ذرا بھی روپیہ لئے خود ان کے پاس بھی کہاں تھا اپنا زیور اپنی بہن کے پاس رہن رکھ کر ان سے روپیہ لیا اور تمام تر اپنے خرچ پر میرا ساتھ دیا یہ ان کا دوسرا احسان ہے جسے میں بھول نہیں سکتا۔

۴: شروع زمانہ میں مجھ پر بڑا ہی سخت گراں تھا۔ اور نوکروں چاکروں پر بڑی ہی سختی

تا بھی بیچاری ہر بار سامنے آکر سینہ سپر ہو جاتیں۔

خدمت قرآن یا خدمت صدق وغیرہ کے سلسلہ میں اگر کوئی بھی خدمت دین کسی درجہ
ں بھی قابل قدر تیری نظر میں مجھ بے مایہ و تباہ کار سے بن پڑی تو وہ ہرگز مجھ سے نہ بن پڑتی اگر
ہ خانگی سکون قلب مجھے حاصل نہ ہوتا جو تیری اس بندی کے طفیل میں مجھے نصیب ہوا۔

لوگ تعزیت کو میرے پاس آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آپ تباہ ہو گئے آپ کا گھر اجڑ گیا
غیرہ۔ میں حیران ہوں کیسی تباہی اور کہاں کی ویرانی ——— اللہ اپنے عزیز بندے کو
بہترین ساعت میں اس دنیا میں بھیجتا ہے جو اس بندے کے حق میں ہو بہترین ساعت
وتی ہے اسی میں اسے واپس بلاتا ہے اس میں ویرانی و بربادی کا ذکر کہاں سے آگیا۔

اُس بندی کے اٹھ جانے سے مجھے یقیناً قدرۃً متعدد تکلیفیں اور بے چینیاں ہیں اور میں
ں پر ہرگز خوشی سے آمادہ نہیں لیکن اگر تیری مرضی اسی میں ہے تو میں ایک بار نہیں ہزار بار
س پر راضی ہوں عقلاً و ارادۃً شائبہ بھی کسی ناخوشی و ناگواری کا اپنے دل میں نہیں لاتا۔

———

شفاء الملک دریابادیؒ

۳۱ اکتوبر ۵ بجے صبح دریاباد غریب خانہ سے دو قدم پر جو ٹی لکھنؤ بلکہ ملک کے نامو
حکیم حاجی عبدالحسیب دریابادی صدر انجمن طبیہ یو۔پی اور قدیم ممبر انڈین میڈیسن بورڈ کا
ہے۔ آج خلاف معمول ان کے ہاں منھ اندھیرے سے یہ چہل پہل کیسی؟ نوکر چاکر، عزیز و
دوست ادھر ادھر دوڑ رہے ہیں۔ گیس کی روشنی میں کام ہو رہا ہے کرسیوں کی جھاڑ پونچھ
ہو رہی ہے کمرے میں فرشیں و فروش بچھ رہے ہیں۔ کوئی تقریب ہے؟ تقریب کیسی؟
تو محرم ہے کوئی اور تہوار ہے؟ حکیم صاحب تو عید بقرعید بلکہ ہولی دیوالی کو بھی لک
سے وطن آیا کرتے ہیں اور جب ہی ان کے لئے یہ ساری تیاریاں پچھلے پہر سے شروع ہو
ہیں ـــــ جی نہیں ان کا جنازہ آرہا ہے میت لاری پر شفاء الملک دریابادی کی آر
ہے ـــــ!

کہنے والا یہ کیا کہہ گیا؟ اور ذرا سے فقرے سے کتنے دلوں پر بجلی گر گرا! اب تو کو
کوبے، بازاروں میں چوراہوں اور گلیوں میں لوگ ٹولیاں بنائے ہر جگہ یہی تذکرہ کر ر
ہیں، ہر زبان پر یہی حسرت ناک نوحہ ہے اسٹیشن کا تار والا جو اکسپریس تار لئے ہوئے تا
کی چھاؤں میں غریب خانہ تک گیا، پکار پکار کر یہ کہتا بھی گیا تھا۔ ماتم کرنے والوں میں بو
بھی ہیں اور جوان بھی عورتیں بھی ہیں اور مرد بھی! اور مسلمان تو خیر ہوتے ہی ہندو بھی

صدق جدید
یکم دسمبر ۱۹۵۵ء

پھر کہیں بلکہ اچھی بڑی تعداد میں ہیں۔

خبر پر یقین آئے نہ آئے؟ کوئی مان رہا ہے کوئی جھٹلا رہا ہے اور آسانی سے یقین آئے بھی تو کیسے؟ ابھی چند گھنٹے قبل یعنی جمعرات کی شام تک تو حکیم صاحب اچھے خاصے نسخہ لکھتے تھے۔ دوسروں کی صحت و زندگی کے ضامن بنے ہوئے تھے گردہ وغیرہ کی جو شکایتیں تھیں وہ بھی اس وقت دور ہو چکی تھیں اور آٹھ بجے شب کو ایک ڈاکٹر دیکھ کر یہ کہہ گئے تھے کہ حکیم صاحب اب اچھے ہیں صرف ضعف باقی رہ گیا ہے ـــــ بشر کی رائے اور اندازہ موت و زندگی سے متعلق! تکلیف دس بجے رات کو شروع ہوئی بکل چند منٹ کے اندر شاید پانچ منٹ کے اندر کشمکش کا خاتمہ!

درد قلب کا دورہ اور شدید ضعف، ہر امکانی تدبیر کے لئے حکیم صاحب کے صاحبزادے حکیم محمد ابن سلمہ پرنسپل طبیہ کالج لکھنؤ موجود، سفر آخرت کی عجلت رکھنے والے طبیب کو نہ کرنہ فرصت اس وقت مال و اولاد پر توجہ و التفات کی زبان پر تو بہ استغفار، ہاتھ دعا کے لئے آسمان کی طرف اٹھے ہوئے۔ حاضرین سے بہ اصرار فرمائش کہ میرے کلمہ شہادت کے گواہ بنو۔ آخری مشروب آب زمزم کے چند قطرے اور آخری کلام کلمہ شہادت اور یہ آیہ کریمہ لا الٰہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین ـــــ جسم صاحبزادے کے آغوش میں اور روح عالم بالا کی سیر کو روانہ ہو گئی۔

رات یاد کر لیجئے کہ جمعہ کی تھی اور ماہ محرم کا متبرک عشرہ اوّل ابھی شروع ہو چکا تھا یوں کہئے کہ ارادی اور تکوینی دونوں قسم کی خوش نصیبیاں اکٹھی ہو گئیں ساری رات نواسوں اور نواسیوں اور بہو اور لڑکی اور عزیزوں اور قریبوں مخلصوں نے تلاوت کرتے نمازیں پڑھتے دعائیں مانگنے میں گزار دی، تعزیت میں آنے والوں اور ٹیلی فون پر تعزیت کرنے والوں کا تانتا رات کے ڈیڑھ بجے تک لگا رہا۔ رونے والوں میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی عیسائی بھی اور سکھ بھی اور آنے والوں میں منسٹروں ہائی کورٹ

کے جیوں، علما اور اطبا و معاصرین سے لے کر نا شناسا سب ہی تھے ۔ بامروت اس کی تھی جیتے خود
طبیبوں کی مجلس نے اتفاق رائے کے ساتھ "محسن طب" کا لقب دیا تھا.
غسل صبح تڑکے عزیزوں اور صالحین کی ایک جماعت نے دیا۔ کفن کے لئے آب زمزم
سے دھلا ہوا کپڑا جو کئی سال سے ساتھ رہتا تھا وہ آج کام آیا. نو بجے نماز جنازہ کا وقت آیا
تو کوٹھی (واقع کنٹونمنٹ روڈ) کا صحن نمازیوں سے کھچا کھچ بھر گیا اور نماز مفتی عبدالقادر صاحب
فرنگی محلی کی امامت میں ادا ہوئی، چہرہ کی رونق، جنازہ کی وہ سج دھج کہ گویا دولہا بارات لیکر
روانہ ہو رہا ہے۔!

۱۲ اکتوبر بروز پیر دریاباد۔
آج قصبہ بھر میں ہڑتال ہے ۔ کیا ہندو کیا مسلمان سب نے اپنی اپنی دوکانیں بلا کسی
کے دباؤ و ترغیب کے خود ہی غم و الم میں بند کر رکھی ہیں۔ اور گھر پر تو کہنا چاہیے ایک میلہ
لگ گیا تھا ۔ چار چار پانچ پانچ کوس کے لوگ اپنے "محسن طب" کی آخری زیارت
جوق در جوق جمع ہو گئے ہیں، اور لکھنؤ کے بارہ بنکی، فیض آباد سے جو مخصوص مخلصین موٹر یا
ریل سے آ گئے ہیں وہ ان کے علاوہ ــــــ وفات شب جمعہ میں تدفین بعد نماز جمعہ
عین صحن مسجد کے بائیں میں، یہ چیزیں کس کے نصیب میں آتی ہیں بجز ازلی خوش نصیبوں
کے ــ لاری رکتی رکاتی بارہ بنکی اور دریاباد کے ریلوے اسٹیشن پر مشتاقان دید کی تمنا
دید کو پورا کرتی ہوئی بعد دوپہر پہونچی ہے. حکیم صاحب کو وطن سے محبت تھی اس
کا اندازہ اسی سے ہوسکتا ہے کہ باوجود ۴۰ سال سے لکھنؤ ہی کے ہو جانے اور عمائد لکھنؤ
میں شمار ہونے کے وصیت اپنے وطن کی ہی تدفین کی بہ تاکید کر گئے. بلکہ خاندانی مسجد کے
بائیں صحن میں جگہ تجویز کر گئے تھے. یہاں پہونچ کر نماز دوبارہ ہوئی. اس لئے کہ بعض
قریبی اعزا لکھنؤ میں نماز سے محروم رہ گئے تھے. اب کی نماز قرابت قریبہ کی بنا پر
نامرسیاہ سے پڑھوائی گئی. اور اس طرح اسے بھی ایک موقع اس طبیب نامور کی آخری

خدمت کا مل کیا۔ ہجوم کا یہ عالم کہ اتنی بڑی جماعت جنازہ قصبہ کی تاریخ میں تو کسی کے علم میں نہیں ـــــ دفن سے قبل جب اس چہرہ کی آخری زیارت کے لئے جواز خود قلندر دیتا اِذن عام ہوا تو کچھ نہ پوچھئے کہ خلقت کس طرح ٹوٹی پڑ رہی تھی معلوم ایسا ہو رہا تھا کہ شام ہو جائے گی اور یہ سلسلہ ختم ہونے میں نہ آئے گا۔ عین اس وقت قصبہ کے بعض خوشحال ہندوؤں کو محض آنسو بہاتے نہیں بلکہ زار و قطار روتے ہوئے ان آنکھوں نے خود دیکھا اور قصبہ کی جو بیوائیں اپنے سرپرست کو رو پیٹ رہی تھیں ان کے اعداد و شمار اب کون فراہم کرتا ـــــ!

کم و بیش مذہبی ہمیشہ سے تھے۔ اب اوسر ۱۲۔ ۱۵ سال سے دینداری میں خاصی ترقی کر لی تھی، نماز روزہ کے فرائض کے علاوہ تلاوت کے بھی بڑے شائق اور پابند ہو گئے تھے۔ اور تہجد بھی جب آنکھ کھل جاتی اور موقع مل جاتا تو پڑھ لیا کرتے تھے۔ بعد نماز فجر دیر تک اپنے معمولات پورے کرتے رہتے۔ ۴۔ ۵ سال ہوئے حج و زیارت سے بھی مشرف ہو چکے تھے اور لوگوں کو کھلانے پلانے، دینے دلانے میں تو برابر قدم آگے ہی رکھتے تھے۔ عزیزوں اور بستی والوں کا خیال خاص طور پر رکھتے تھے۔ اس کے باوجود تکلف رسمی، زندہ دلی اور بذلہ سنجی، لطیفہ گوئی میں اپنی مثال آپ تھے۔ تعلقات بڑے بڑے حکام امراء رؤسا سے گہرے تھے۔ تمکنت نام کو بھی نہ تھی۔ غریب سے غریب شخص سے بھی اسی شفقت اور ملائمت سے پیش آتے اور کوشش یہ کرتے کہ اس کا دل ہاتھ میں لئے رہتے ـــــ ۱۹۲۹ء کا ذکر ہے کہ ایک لڑکی کی شادی لکھنؤ میں کی۔ دعوت بڑے پیمانہ پر نیا بارہ باؤس میں کی تھی۔ ایک صاحب شریف صورت مگر بہت پھٹے حالوں بن بلائے آکر شریک ہو گئے اسی دسترخوان پر جو میاں لوگ، بیٹھے ہوئے تھے انہیں سخت ناگواری پیدا ہوگئی اور انھوں نے کھانے سے ہاتھ روک لیا۔ جو صاحب منتظم دعوت تھے انھوں نے یہ رنگ دیکھ کر سختی سے ان صاحب سے اٹھ جانے کو کہا۔ یہ زیادتی دور کر

مریے کی تھی یاد رکھا از کم مجھ سے تو نہ دیکھی گئی دوڑ کر حکیم صاحب کو بلا لایا وہ آتے ہی ان ہی بلانے والا کی طرف مخاطب ہو کر بولے اخاہ میرے آپ یہاں کہاں بیٹھ گئے آپ کا شمار تو مہمانوں میں نہیں گھر والوں چنانچہ آپ آئیے میرے ساتھ کھانا کھائیے گا۔ میں نے بھی نہیں کھایا ہے،" چنانچہ انھیں اپنے ساتھ ہی بٹھا کر کھلایا۔

سیاسی معاملات میں دلچسپی شروع سے لیتے رہے۔ تحریک خلافت کے زمانہ میں اس میں شریک رہے پھر مسلم لیگ کے زمانہ عروج میں اس میں بھی پیش پیش رہے لکھنؤ کی مسلم لیگ کے صدر بھی رہے مگر اس کے ساتھ کسی دوسرے مذہب و ملت والے اور کسی سیاسی پارٹی سے مخالفت نہ مول لی۔ ان کی ملت پروری اور ملک دوستی کے درمیان ہرگز کوئی تضاد نہ تھا بلکہ جیسے گہرے تعلقات لیگ کے لیڈروں سے تھے ویسے ہی انھوں نے سر سیتارام، موہن لال سکسینہ، آچاریہ نریندر دیو وغیرہم سے بھی قائم رکھے اور اپنی مرنجاں مرنج طبیعت اور سلامت روی کے باعث کانگریسی حلقوں میں آخر تک مقبول و ممدوح رہے ———

وقت آگیا تو جان ایک سچے مسلمان کی طرح جان آفریں کے سپرد کر دی۔ اور دیکھنے والوں کے سامنے ایک بار پھر یہ حقیقت بے نقاب ہو کر آگئی کہ جب وقت معززہ آ جاتا ہے تو بڑے سے بڑا طبیب بھی اپنے کو ویسا ہی بے بس پاتا ہے جیسا کہ ایک عامی سے عامی انسان ——— پیدائش ۱۸۶۸ء کی تھی اس حساب سے عمر ۷۰ سال کی ہوئی۔

نئی نویلی

وہ ابھی بالکل نوجوان تھی۔ شادی کو پورا سال بھی ابھی کہاں گزرا۔ دس ہی گیارہ مہینے تو ہوئے۔ قریبی رشتے سے میری بھتیجی تھی، اردو ترجمہ قرآن پڑھنے میں شاگرد بھی۔ بڑی مذہبی، بڑی صالح، نماز کی عاشق، روزے کی شیدائی، سب کی ہمدرد و غمخوار، بڑی مخلص خدمت گزار۔ بچہ ہنستا کھیلتا پیدا ہوا۔ دوسری رات کو بیمار پڑی اور تیسری صبح کو قبل اس کے کہ آفتاب اپنے پورے عروج کو پہونچے اس کی عمر کا آفتاب غروب ہو گیا! اناللہ۔ زچگی کی موت شہادت کی موت ہے۔ سچے کا وعدہ جھوٹا نہیں ہو سکتا۔ پھر دفن کے وقت شب جمعہ شروع ہو چکی تھی۔ زبان پر آخر تک یا اللہ یا رحمن یا رحیم رہا۔ دوسروں سے سورۂ یاسین فرمائش کر کے پڑھوائی۔ مردہ چہرے پر بجائے مُردنی اور بے رونقی کے رونق اور تازگی۔ آنکھیں ذرا کھلی رہ گئیں، ان سے بجائے بدنمائی کے اور خوش نمائی و دل زیبائی! نام ایک پیغمبر زادی کے نام پر "رقیہ" تھا۔ قبر میں باپ نے اتارا۔ یہ نہ پوچھئے کہ کس دل سے ۔۔۔۔ اس جواں مرگ پیغمبر زادی کو بھی قبر میں اتارنے والے اُس کے والد ماجد اللہ کے محبوب ترین پیغمبر ہی تھے! اشرف اللہ امت کا باپ اپنے فرزندوں کو سخت سے سخت مصیبت کے وقت کیسے کیسے سبق تسلی اور تعزیت کے اپنی زندگی کے دے گیا ہے!

موت کا وقت عجیب پُراثر پُردرد تھا۔ لکھنؤ کے ایک حاذق طبیب بورڈ آف سیڈ بین

---

۱ منقول از صدق: ۱۳ مارچ ۱۹۳۳ء

کے پلنے ممبر شفاء الملک کے خطاب سے سرفراز ابھی ہاتھ نبض پر رکھے ہوئے ہیں ابھی جواہر مہرہ حلق سے اتارنے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں ابھی آنکھوں کی پتلی کا معائنہ کر رہے ہیں کہ زندگی کے کچھ آثار باقی بھی ہیں! ۔۔۔۔ گویا یہ تدبیریں موت کے فرشتے کا ہاتھ پکڑ لیں گی ۔۔ ماں کی دلدوز آہیں اور دعائیں! کس قلم کے بس میں ہے کہ معصوم ماں کے رنج کی کرسکے؛ لیکن رنج بحمد اللہ مسلمان ماں کا تھا! ادھر غشی سے اٹھی ادھر سلسلہ پھر دعا و مناجات کا تلاوت قرآن شروع ہوگیا! اے اللہ تیری امانت تیرے سپرد نعمت تو ہی نے دی تھی اور اسے واپس بھی لے لیا! ۔۔۔ مسلمان عورت بھی جنت کتنے طریقوں سے لے سکتی ہے!

جسم رنجور، روح مسرور! اب کوئی نہیں پہچان نہیں پڑتا، مرنے والی نے ہر حس و اضطراب سے نہیں سکون و اطمینان سے کہا۔ سکرات شروع ہو چکا تھا بصارت اپنا فعل چھوڑ چکی تھی اور معاً زبان بھی بند ہوگئی ہونٹ دو بار اللہ اللہ کہنے کے لئے ہلے اور ایمان والی کی روح راضیۃ مرضیۃ کی بشارت پر دوڑتی ہوئی اڑتی ہوئی روانہ ہوگئی! ۔۔۔ اللہ کی جو بندی اپنے مولیٰ کی یاد میں کسی حال میں غافل نہ ہوئی تھی جس نے نماز کو شادی کے نغموں اور رخصتی کے ہنگاموں میں بھی قضا نہ ہونے دیا تھا کیسے ممکن تھا کہ مولیٰ کی یاد اس وقت اس کا ساتھ چھوڑ دیتی کوئی اس یاد کی طرف دوڑ کر دیکھے تو وہ یاد خود کب اس کا پیچھا چھوڑتی ہے؟ ۔۔۔ فاذکرونی اذکرکم کی ایک نئی تفسیر عملی رنگ میں!

لکھنؤ کا مردِ بزرگ

۲۰ اکتوبر کو شب آخر ہو رہی تھی اور ۲۱ کے طلوعِ فجر میں ابھی دو گھنٹہ کی دیر تھی کہ شہر کے ایک تہجد گذار اور شاید سب سے معمر مسلمان نے ۹۴-۹۵ سال کی عمر میں اس دار فانی سے مراجعت اختیار فرمائی ـــ مولوی حاجی محمد نسیم صاحب بی، اے ایڈووکیٹ کے نام نامی سے آج سے ۴۵-۵۰ سال قبل شہر لکھنؤ صوبہ اودھ میں کون پڑھا لکھا ناواقف تھا؟ اپنے زمانہ کے نامور ترین وکیل دیوانی تھے اور رئیس اس زمانہ میں جب کہ مقابلہ میں انگریز بیرسٹروں کے علاوہ نامی ہندو وکیلوں کی بھی تعداد موجود تھی، مذہبی خیال کے ہمیشہ رہے، حالانکہ بی، اے اس وقت کیا تھا جب انگریزی تعلیم ہی شاید کفر و الحاد کے مرادف تھی جب بڑے صاحبزادے محمد وسیم بیرسٹرایٹ لا کا کام خوب چل نکلا۔ اور پریکٹس کی طرح دینداری بھی ان کے ورثہ میں آ گئی تو خود کام چھوڑ کر تمام تر عبادت اور ذکر و شغل ہی میں مصروف رہنے لگے ۱۹۲۶ء میں علی برادران کے ساتھ حج کیا۔ اور زندگی کے آخری ۲۵-۳۰ سال کہنا چاہیے کہ خدمت خلق و خدمت خالق ہی کی نذر کر دیئے ـــ شہر کی بڑی چھوٹی شاید ہی کوئی ایسی اسلامی تحریک ہو گی جو ان کی مالی امداد سے بار بار مستفید نہ ہوئی ہو اور دینی رسالوں کو تو درس گاہوں کو، طلبہ کو، نادار عزیزوں کو، یتیموں کو، بیواؤں کو خفیہ و علانیہ جو کچھ دیتے رہے اس کا حساب کون لگا سکتا ہے۔

وسیع، پرفضا اور لق و دق کوٹھی ڈالی باغ گویا ایک مستقل جہان سرائی تھی اور لکھنؤ کے ان چار پانچ مکانوں میں تھی جن کے دروازے چوبیس گھنٹہ باہر سے آنے والے مسلمانوں کی میزبانی

(منقول از صدق، ۲۰ نومبر ۱۹۵۳ء)

کے لئے کھلے رہتے تھے آج ٹرکی کے عدنان بے آئے ہیں کل حکیم اجمل خاں ٹھہرے ہوئے ہیں پرسوں ڈاکٹر انصاری کا استقبال ہو رہا ہے خلافت اور لیگ دونوں کے زمانۂ عروج میں ہمہ بدایاں ان کے ساتھ رہیں۔ وسیم مرحوم پاکستان چلے گئے اور وہاں کے ایڈوکیٹ جنرل ہو کر کوئی تین سال ہوئے کراچی میں وفات پا گئے ـــــ دو لڑکے نیشنلسٹ کیمپ میں رہے ایک علی گڑھ میں تاریخ و سیاسیات کے سینیر استاد ہیں دوسرے جامعہ ملیہ کے وائس چانسلر ہیں حقیقی بھانجوں میں ایک مشہور خلافتی اور کانگریسی ثم لیگی لیڈر چودھری خلیق الزماں اس وقت مشرقی پاکستان کے گورنر ہیں اور دوسرے ڈاکٹر سلیم الزماں کراچی میں غالباً کیمیکل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ہیں ــ حفظ صحت کا بڑا خیال اور اہتمام رکھتے تھے چنانچہ باوجود ضعیف الجثہ ہونے کے آخر عمر تک صبح کی مشی (ٹہلنے) کی عادت قائم رکھی، ہوش و حواس میں ذرا فرق آگیا تھا مگر نہ ایسا کہ بہت نمایاں ہو زندگی کی آخری شب حسب معمول نماز عشاء کے بعد وظیفہ پڑھتے ہوئے سو گئے۔ ڈھائی بجے شب کو طبیعت پھر بے چین ہوئی نرس نے گولی دی ذرا سکون ہوا ۴½ کا وقت تھا تیمار دار لڑکی نے کہا کہ آج آپ نے تہجد کی نماز نہیں پڑھی تیمم کا پیالہ مانگا اس پر مارنے کے لئے ہاتھ اٹھائے ہی تھے کہ ہاتھ بے کار ہو گئے ایک ہچکی آئی اور معاً روح سیکڑوں ہزارہا بندگان خدا کی دعاؤں کی جھرمٹ میں اعلیٰ علیین کو روانہ ہو گئی ـــــ مرد بزرگ عمر ہی کے اعتبار سے بزرگ نہ رہا حسن خاتمہ کے لحاظ سے بھی بزرگوں تک کے لئے قابل رشک نکلا نماز جنازہ مولانا عبد الشکور صاحب نے پڑھائی اور تدفین خاندانی قبرستان میں قصبہ گدھی محلول ضلع بارہ بنکی میں ہوئی۔ اللہم اغفر لہ وارحمہ۔

"مردِ مومن کی وفات"

یو.پی کونسل کے سابق اور بہت قدیم ممبر اور یو.پی کونسل کے سابق نائب صدر حاجی شیخ مسعود الزماں رئیس اور بیرسٹر (باندا)، ۲۰ جنوری ۱۹۵۸ء کو عین نماز فجر کے وقت دنیا سے رخصت ہوئے اور اس انوکھے انداز سے کہ گویا سفرِ آخرت پر نہیں بلکہ یہیں کہیں کے سفر پر خدا حافظ کہتے اور سلام کرتے ہوئے رخصت ہوتے رہے ہیں! — مومن کے نفسِ مطمئنہ کے لئے بھی مالک و مولا کی طرف سے راہیں بے شمار کھلی ہوئی ہیں!

مدیر صدق کے قریب ترین عزیزوں میں سے تھے اور کالج میں اس کے ساتھ دو سال پڑھے ہوئے بھی۔ انگریزی ترجمہ و تفسیر کے کام کا جب آغاز ہوا، تو اپنا ٹائپ رائٹر نذر کیا اور اتنا ہی نہیں بلکہ اپنے کتب خانے سے انگریزی کی بیش قیمت انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (گیارھویں ایڈیشن) کی پینتیس ۳۵ ضخیم جلدیں بھی فراخدلی کے ساتھ پیش کریں! بڑا رقیق قلب رکھتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ارادت والہانہ نعتیہ مضمون سن کر رو پڑتے نماز کے تو خیر پابند تھے ہی روزے فرض کے علاوہ بھی بڑے شوق سے سال میں کئی بار رکھ لیا کرتے تھے۔ حج ادا کر آئے تھے اور اب دوبارہ جانے کے خیال میں تھے زکوٰۃ کے مسائل کا گہرا علم رکھتے تھے اور ادائے زکوٰۃ کے بڑے سرگرم ساعی صوبہ کونسل میں بار بار زکوٰۃ کے بل کے نام سے قانون صوبہ کے سارے مسلمانوں کے لئے پیش کیا کئے۔ سیرت نبوی کے نام سے ایک کتاب بھی سیرۃ النبی پر غیر مسلموں میں تبلیغ کے نقطہ نظر سے لکھی اور چھپوائی — اچھے خاصے شگفتہ و بشاش تھے کہ قبل فجر بڑے تڑکے کو ہچکی کر بلوایا

منقول از صدق جدید ۱۳ فروری ۱۹۵۸ء

اور بولے کہ بیٹا ہم رخصت ہو رہے ہیں خدا حافظ. ڈاکٹر فوراً بلائے گئے اور وہ اطمینان دلا کر چلے گئے، تنفس شروع ہو چکا تھا۔ اب ایک لڑکے سے کہا کہ قرآن مجید سناؤ، پھر خود بھی پوری آواز سے سورۃ مزمل شروع کی۔ پڑھی اور اس کے بعد کلمہ پڑھتے ہوئے انگشت شہادت اٹھائی اور کہا "گواہ رہنا" معاً ہچکی آئی اور طائر روح قفس خالی کر کے پرواز کر گیا۔ ایک لڑکے نے جب آیۃ الکرسی سنائی تو خوش ہو گئے بولے کہ آج کمائی وصول ہو گئی۔ ایسی مومنانہ موت پر رشک کس کو نہ آئے گا ۔؟

چودھری سمیع الزماں مرحوم

○

نوٹ لکھے جا چکے تھے کہ لکھنؤ کے حاجی شیخ سمیع الزماں کی وفات کی خبر (۶ اپریل) معلوم ہوئی۔ لکھنؤ میں ایک خاندان قصبہ بجنور کے شیخ زادوں صدیقی کا آباد ہے جس کا شمار لکھنؤ کے عمائدین میں ہے اور شہر میں اس کا خاص اثر رہا ہے۔ مشہور سیاسی لیڈر چودھری خلیق الزماں اسی خاندان کے ہیں اور مرحوم کے چھوٹے بھائی ہیں مرحوم کو آرٹ سے خاص دلچسپی تھی اور دستی تصویر کشی میں خاص شہرت حاصل کر لی تھی، مرحوم کے حقیقی ماموں حاجی محمد نسیم مرحوم لکھنؤ کے نامور ایڈوکیٹ تھے اور ماموں زاد بھائی مسٹر محمد وسیم مرحوم بیرسٹر پاکستان جا کر وہاں کے پہلے ایڈوکیٹ جنرل مقرر ہوئے۔ چھوٹے بھائی ڈاکٹر سلیم الزماں بہ حیثیت ایک سائنسٹ کے پاکستان ہی میں نہیں دنیا کے سائنسی حلقہ میں ایک مرتبہ رکھتے ہیں۔ اب لکھنؤ میں سردار خاندان یہی تھے اور عمر کوئی ۸۵۔۸۶ کے درمیان رکھتے تھے۔ اللہ مغفرت کرے۔

منقول از صدق جدید ۲۵ اپریل ۱۹۶۹ء

ایک خدمت گار کی یاد میں

خدمت گار! یہ طبقہ بھی بھلا اس قابل ہے کہ نمایاں لوگ اس کا ذکر خیر اپنی مجلسوں میں لائیں۔ چہ جائیکہ اخبار کے صفحہ میں یہ تذکرے بار پائیں! غلامی کی رسم اب ضابطہ سے شاید مٹ چکی ہے لیکن عملاً برتاؤ کے لحاظ سے ہمارے ہاں کے نوکر چاکر خصوصاً گھروں کے پروردے ٹھیک اسی جگہ ہیں جو یورپ/روما میں غلاموں اور پشتینی غلاموں کیلئے مخصوص تھی۔ ایرانی اور ہندی تہذیب کے دوگتہ نے مخدوم و خادم آقا اور چاکر کے اس بین المشرقین فرق کو کم نہیں کیا ہے اور بڑھا دیا ہے۔

حاجی محب علی مرحوم ہمارے گھر کے پروردہ تھے (یہ اصطلاح شاید دوسرے ملک والوں کی سمجھ میں نہ آسکے) ان کے والد نے ہمارے ہی ہاں کی ملازمت میں انتقال کیا۔ ان کی ماں بھی ہیں بڑھیا بوڑھی ہوئیں۔ اور ابھی زندہ ہیں۔ محب علی کی پیدائش کے وقت سے گویا وراثتہً ہماری ملک ہوگئے — میاں لوگوں کی دنیا میں سلطان ابن سلطان کی طرح آقا ابن آقا اور خادم اسی طرح نسلاً بعد نسل ہوتے چلے آئے ہیں۔

پیدائش سنہ ۱۹۰۱ء کی عمر کے ۵۰ سال ہماری ہی ڈیوڑھی پر ادنیٰ معاوضہ پر گزار دیئے انتہائی اخلاص، دیانت داری، وفاداری، ہواخواہی اور نمک حلالی" کے ساتھ (یہ آخری لفظ بھی آقاؤں اور آقازادوں کے لغت کا ہے) جان ۱۲ رمضان (۲۷ جون) یوم چہارشنبہ کی شام کو ۸½ بجے جب مسلمان افطار کی اذانیں دینے اور تراویح میں قرآن سنانے میں لگے ہوئے تھے، جان آفرین کے سپرد کردی۔ خدمت گار کا آقا صرف ایک نہیں ہوتا گھر کا مالک، آقازادوں اور آقازادیوں ان کے بھائی بھتیجوں سب کی رضا جوئی یکساں اس پر واجب ہوتی ہے ۔۔۔ اس امتحان میں پورا اترنا پہاڑ سے دودھ کی نہر کاٹ کر لانا ہے۔

صدق جدید ۱۳ جولائی سنہ ۱۹۵۱ء

بیماری ضعف معدہ کی لاحق ہوئی! آج کی زبان میں اسٹر یونک دق، صبر آزما شدائد اور جان
گسل تکلیفوں میں پھیپھڑوں کی دق سے ذرا کم نہیں۔ وہی پور پور میں شدید درد، وہی رگ رگ میں
کھنچاؤ، وہی بیتاب کر دینے والی اندرونی سوزش، وہی تڑپا دینے والی جلن تپکن، وہی انتہائی ۔
ضعف و لاغری، وہی آخر میں دم بدم دستوں کا بلا اختیار چلے آتے رہنا اور جسم کا گوشت گل کر
صرف ہڈیوں کا ہار باقی رہ جانا! غریب محب علی نے ساری تکلیفیں ایک ایک کر کے جھیلیں دو
چار دن نہیں، مہینوں جھیلیں مدت سے صحت کے بجائے موت کی تمنا کرنا شروع کر دی تھی۔ ادھر
تیمار دار جو بیسوں گھنٹوں کی ڈیوٹی سے الگ عاجز آگئے تھے عبرت کے قابل تھا یہ منظر کہ ایک اچھی
چوڑی چکلی ہڈیوں کا اپنی جوانی میں کشتی لڑا ہوا۔ نفاست پسند اور بڑا صاحب تدبیر مستعد سرگرم
انسان چارپائی پر معذوری، بے کسی اور بے بسی کی تصویر بنا ہوا پڑا ہے پٹی سے متصل پیشاب دانی رکھی ہوئی
ہے اور پاٹ لگا ہوا ہے اور مریض بغیر کسی کے سہارے کے کروٹ لینے پر قادر نہیں!

۱۴ رمضان آخر وقت عصر میں جب نزع شروع ہوئی تو میں نے سب سے پہلے پہچانا۔ آنکھیں
بیٹھی ہوئی تھیں اور تنفس بگڑ چکا تھا۔ الجھن بے انتہا بڑھی ہوئی تھی۔ میں نے کہا کہ تسکین یا اسلام
پڑھنے سے ہوگی آواز سے نہ پڑھا جا سکے تو اندر اس کا ورد رکھو خود بھی کئی بار پڑھ کر دم کیا ہاتھ سرد
ہو چکے تھے۔ پیر دن میں کچھ گرمی باقی تھی ایک طبیب کو بلا کر دکھایا انھوں نے کہا کہ نبض بال کی سی
باریک چل رہی ہے۔ بعد مغرب سوئے تنفس نمایاں ہوگیا عورتوں نے چیخ چیخ کر رونا شروع کر
دیا میں زمین پر بیٹھ گیا اور لب مرگ مریض کے سامنے میں کلمہ پڑھنا شروع کر دیا۔ ہوش و حواس
سب بالکل درست تھے۔ ایک عزیز سرہانے کھڑے کہتے گئے کہ یہ ماں ہیں یہ بیوی ہیں اور وہ
ایک ایک کے لئے لفظ معافی زبان پر لاتے گئے۔ آخر میں مجھے بتایا کہ یہ مولانا صاحب بیٹھے ہیں
اس پر اپنا سوکھا ہوا لیکن متورم ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا اور کہا کہ "معاف کیجے گا" میں نے ہاتھ
دبا کر اور رو رو کر کہا کہ معافی تو دونوں طرف سے ہونا چاہئے میں نے معاف کیا تم بھی معاف کر دو۔
ایک حافظ نے سورہ یٰسین شروع کر دی اور چند منٹ کے اندر روح جسم کا ساتھ بالکل چھوڑ

گئی چہرہ خود بخود قبلہ رو ہوگیا ۔

ساری رات گزری جس طرح گزری غسل وغیرہ کا انتظام صبح شروع ہوا جب تختہ پر لٹایا اور سب کپڑے اتار لیے گئے تو آنکھوں نے اس جسم کا نظارہ کیا جو سوکھ کر محض ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا تھا ۔ (جیسا کہ ڈاکٹری کتابوں میں اناٹومی کے نقشے ہوتے ہیں) اور زبان اپنے کو نہ روک سکی پکار کر آنسوؤں سے بھیگی ہوئی آواز میں کہا کہ یہ وہی چہرہ ہے جو ابھی کل تک ساری قوتیں ساری توانائیاں ایک میری خوشنودی کے لئے وقف کیے ہوئے تھا خود بڑی بڑی بے چینی اٹھائی کہ میں نہ بے چین ہونے پاؤں ۔ یہ ہاتھ وہ ہیں جو چوبیس گھنٹے میری ہی خدمت کے لئے وقف رہتے تھے ان چوبیس میں خدا معلوم کتنی بار قینچیاں پڑی ہوں گی اور آج بھی کتنی بار ان کا بیجا استعمال میری ذات سے ہوا ہوگا ۔ اور یہ سوکھی ہوئی ٹانگیں اور پنڈلیاں اور یہ متورم پیر خدا معلوم کتنی بار میری وجہ سے دوڑے ہوں گے تھکے ہوں گے ؟

آج اصل منظر سے بہت دور بالکل بے تعلق یہ کاغذ پر چھپے ہوئے الفاظ کچھ بے جان سے نظر آرہے ہوں گے عین موقع پر ان کا درجہ قال کا نہ تھا حال کا تھا ۔

غسل کا اصل کام میرے حقیقی خالہ زاد بھائی نے انجام دیا وضو کا وقت آیا تو اعضائے وضو پر پانی میں خود ڈالتا گیا اور رو رو کر جس طرح دعا مظلوم و مرحوم خادم کی مغفرت کے لئے کرتا گیا اسی طرح اس کے زندہ ظالم آقا کے لئے بھی ـــــ دل نے کہا کہ جنت میں خادم مخدوم کہاں وہاں تو سب مخدوم ہی ہوں گے ۔ تاہم یہ شخص جو دنیا میں مجھ پر اتنی جان چھڑکتا رہا ۔ اور اس طرح یہ جذبہ اس کی فطرت میں راسخ ہوگیا ہے کہ عجب نہیں جو یہ حقیقت میں کبھی (اگر اللہ نے وہاں اپنے کرم بے حساب سے پہنچا دیا) اپنے کو میری خدمت ہی کے لیے پیش کرتا رہے ۔

کفن پہناتے وقت جب کفنی میں نے گردن میں ڈالی ہے تو یہ یاد آیا کہ زندگی میں بے شمار بار اس نے میرے کپڑوں کی دیکھ بھال رکھی ہے آج ایک بار تو عالم ناسوت میں اس کی یہ آخری خدمت کر لوں ۔ نماز اور تدفین سب ویسی ہی ہوئی جیسی ایک مسلمان کی ہوتی ہے ۔ بڑی تمنا مرحوم کو اس کی

تھی کہ جمعہ کا دن نصیب ہو۔ اللہ نے یہ تمنا پوری کر دی کہ رمضان مبارک کا آخری عشرہ عتقٌ من النار کا وعدہ یاد کر لیجیے گا کہ یہ تمام تر آزادی مخلص! اور تدفین ایسے وقت ہوئی کہ قبر میں پہلی رات دہی جمعہ کی رات اور شب قدر کی ایک رات (۲۷ویں شب) اکھٹی لدی تھیں پھر دق کے مرض میں شہادت کی بشارت اس کے علاوہ اب اس اخلاص محض کو آنکھیں عمر بھر ترستی رہیں گی۔

ترا عاشق شود پیدا و لے مجنوں نخواہد شد!

عُلماءِ کرام و بزرگانِ طریقت

قطب ارشاد کا وصال

جس وقت کا دھڑکا تھا وہ وقت آگیا۔ آخر جولائی کی غالباً ۲۰ ارتی کو میرے بھتیجے کا خط تھانہ بھون سے حسب ذیل وصول ہوا۔

۔ یہاں پہونچ کر واقعی حضرت کی طبیعت بہت زائد علیل پائی۔ نماز جمعہ کے قبل سے لے کر مغرب تک مسلسل غفلت و غنودگی طاری رہی اور حضرت قدس مخصوص حضرات سے بھی مخاطب نہ ہوئے۔ اسہال کی شکایت قبل ہی سے تھی۔ مگر پرسوں سے غفلت اور غنودگی بھی شروع ہوگئی ہے۔

میرا ذکر ایک بار مولانا کے خادم خاص سلیمان نے قبل نماز جمعہ کیا، مگر حضرت غافل ہوگئے۔ نشست کے وقت مولوی جمیل صاحب نے میری اور دوسرے لوگوں کی اطلاع کرنا چاہی مگر اس وقت سے لے کر مغرب تک حضرت مسلسل غافل رہے۔ اسی لیے حاضری سے محرومی رہی۔ اللہ صحت دے۔ بعد مغرب خواجہ صاحب نے میرا ذکر کیا حضرت نے میرا نام لیا اور پوچھا کہ اس وقت موجود ہیں؟ خواجہ صاحب نے کہا کہ نشست کے وقت تو تھے۔ فرمایا کہ اس قابل کہاں کہ کسی سے گفتگو کر سکوں یا متوجہ ہو سکوں اس کے بعد حضرت غافل ہوگئے۔ میں نے خط پڑھتے ہی کہا کہ خدا نخواستہ یہ بیماری ہی آخر ہے۔

رنجش از سوداد از ضعف ابود   بوئے بہبزم چو بیا آمد نہ دود
طبیب الٰہی نادی۔ اصطلاح میں جسے غفلت اور غنودگی سے تعبیر کرتے ہیں یہ

صدق ۲ راگست ۱۹۴۳ء

توسب سامان خلق سے انقطاع اور آخرت کی طرف توجہ دیکھوئی کے معلوم ہو رہے ہیں اور یہ عارضی و وقتی غیبت تمہید نظر آ رہی ہے۔ طویل اور ناسوتی: معیار سے ابدی غیبت کی! ـــــ صلا میں ایک نوٹ اس کے قبل دیا جا چکا تھا صلا میں دوسرا نوٹ اس خط کی بنیاد پر دیا گیا! دل و زبان دعاؤں میں لگ گئے ـــ دعائیں اپنے ہی مفاد کے خاطر اور اپنی ہی خود غرضی کی بنا پر ـــ خود حضرات مولانا پر اب مراسلت کا بار ڈالنے کا کیا موقع تھا دمل بلگرامی بہت یاد آئے ـــ وہ ایسے موقعوں کے لیے بہت موزوں تھے اب خود ہی مرحوم ہو چکے ہیں، قیر بعد غور خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوب ریٹائرڈ انسپکٹر آف اسکولز (مولانا کے عاشق زار اور خلیفہ خاص) تھانہ بھون کی خدمت میں خط بھیج کر درخواست کی گئی کہ حالات کی جلد جلد اطلاع پہونچتی رہے۔
اپنے خط کی عبارت اب کہاں یاد، البتہ ایک فقرہ یہ یاد ہے کہ "اللہ سے دعا ہے کہ حضرت کی موت حیات کو ہم نیاز مندوں کی مرضی پر چھوڑ دے"۔ ۷ جولائی کی دوپہر کو عین انتظار میں خواجہ کا کارڈ، مارکا لکھا ہوا پہونچا۔

"والا نامہ شرف صدور کی پایا حضرت کی خدمت میں پہلے خلاصہ پھر بعینہٖ زبانی پیش کیا ـــ فرمایا "یہ آپ کی محبت ہے اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے۔" جناب حکیم حافظ عبدالمجید صاحب لکھنوی کا علاج بدستور ہے بفضلہ تعالیٰ افاقہ کی صورت معلوم ہو رہی ہے گو ابھی عوارض موجود ہیں۔ بالخصوص ضعف بے انتہا ہے۔ غذا ہضم سے نہیں ہوئی تھی۔ کل سے بشیر کا آبجوش شروع ہوا ہے خدا کرے روز بروز صحت و قوت ہوتی چلی جائے۔ اسی حالت میں بھی وہی احساسات، وہی انتظامات وہی ضروری امور میں تنقیحات و تدقیقات موجود ہیں جن سے سب کو حیرت ہے۔ اللہ تعالیٰ اس چشمۂ فیض کو ہمیشہ جاری رکھے۔ آپ نے اپنی دعا میں جو صیغہ ارقام فرمایا ہے وہ درحقیقت ہم سب کے قلوب کی ترجمانی ہے ان شاء اللہ حسب ہدایت خیریت سے مطلع کرتا رہوں گا۔"

اس خط سے ایک آن کی آن دل کو ڈھارس ہوئی ٹوٹی ہوئی امید ذرا کی ذرا بندھی ....

شاید کہ امت محمدیہ کو وقت کی اس نعمت عظمیٰ سے فائدہ اٹھانے کچھ اور مہلت مل گئی ہو۔

* * *

کسے خبر تھی کہ عین جس وقت یہ تسلی نامہ پڑھ رہا تھا، ساعت موعود اتنی قریب آگئی تھی آفتاب علم و عرفان کی آخری کرنیں بھی روپوش ہونے کو تھیں، اللہ کی رحمت ناا ہلوں اور نا قدروں لوگوں سے واپس لی جارہی تھی۔ رسول اسلام کا ایک سچا جانشین اپنے مالک و مولیٰ کے دربار میں حضوری کے لئے بے قرار ہو رہا تھا۔ لشکر اسلام کا سب سے جرنیل دین کے ہر ہر محاذ پر ہر ہر معرکہ ہر ہر مورچہ کا دلاور اپنے جسم کا پور پور دین کی راہ میں چور چور کئے ہوئے، قلب خاشع و نفس مطمئنہ کے ساتھ عالم ناسوت کی بالکل آخری سرحدوں سے گذر رہا تھا۔ ۲۲ جولائی کو لکھنؤ سے ایک عزیز کا خط ۲۲ جولائی کا لکھا ہوا حسب ذیل ملا۔

"شب کو بعد عشاء خبر ملی کہ حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ رفیق اعلیٰ سے جا ملے انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ادھر افاقہ کا حال معلوم کر کے اطمینان ہو گیا تھا کہ ہم بے راہ روؤں کے سنبھالنے کا یہ ستون ابھی کچھ دنوں کے لئے قائم رہنے دیا ہے مگر آہ کہ وہ کل مدت دو ہی تین دن میں ختم ہو گئی۔ عمر شریف اور ضعف کی زیادتی نے افاقہ کی خبر کے باوجود بھی حالت کی اطلاع خبر سننے کے لئے ایک حد تک تیار کر رکھی تھیں اس پر بھی اتنا سخت تھا کہ قلب میں ایک دھکا سا لگا اور کچھ دیر تک قلب و دماغ میں ایک ہیجانی کیفیت برپا رہی۔ زبان سے تو حسب عادت انا للہ کہہ دیا لیکن دیر تک نہ سمجھ میں آیا کہ کیا کیا جائے۔ بعد میں دعائے مغفرت و بلندی مراتب کے لئے کی۔ لیکن بار بار یہ بھی خیال آتا تھا کہ ایسی ہستی کے لئے کہ ایسی ہستی کے لئے یہ چیزیں تو گویا یقینی ہیں، پھر ان کی کیا ضرورت۔ لیکن پھر اس کے اور ایصال ثواب کی دوسری صورتوں کے علاوہ کیا کیا جائے؟ چنانچہ کئی بار دعا کر چکا ہوں۔ چند اجزائے قرآنی پڑھ کر بھی ایصال ثواب کیا۔"

انا للہ وانا الیہ راجعون۔ آہ کہ طبیبوں کی اٹکل پر قائم کی ہوئی امیدوں کی بنیاد

عیسی دیت پرنکلی! اور بشری تدبیر نے خداوندی تقدیر کے مقابلہ میں کس بری طرح شکست کھائی! مولانا میرے اُستاد تھے، مقتدا تھے، سردار تھے اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ میرے محبوب تھے۔ آہ! کہ عقیدت، عظمت، محبت تینوں ایک ہی وقت میں کچل کر رہ گئیں۔ تعزیت کا مستحق میں خود ہوں، کسی دوسرے سے کیا تعزیت کروں ــــــ اللہ نے ان کی ذات میں نور حق کی ایک جھلک دکھائی دی تھی۔ ولی کامل کا نمونہ اس بیسوی صدی میں دکھادیا تھا۔ ــہ

ماشارا فود مطلق دیده ایم
نور مطلق را بهمه حق دیده ایم

دین کے خادم اور رہنما اور بھی اس وقت اچھے اچھے موجود ہیں پر وہ ایک ہستی ان سب سے نرالی ان سب سے انوکھی اپنی نظیر بس آپ تھی۔! ع

عالم میں تم سے لاکھ سہی، تم مگر کہاں
بسیار خوباں دیده ام لیکن تو چیزے دیگری!

اللہ کے اس ولی کے حق میں دعائیں کرانا اس کا نہیں اپنا مرتبہ بڑھانے کے لئے ہیں ــہ

مسجدوں سے اور بڑھتی ہے رفعت جبین کی

درود خوانی سے مرتبہ رسول اکرم صلعم کا نہیں بڑھتا خود اپنا ربط و تعلق اس ذات اقدس کے ساتھ زیادہ گہرا اور راسخ ہوتا ہے۔

تم کے لئے اپنی عمر کا اب جتنا بھی حصہ باقی ہے۔ مولانا قدس اللہ سرہ کے مناقب وفضائل کے بعض گوشوں پر انشاء اللہ حسب توفیق ان صفحات میں گذارشیں پیش ہوتی رہیں گی، اس وقت تو مقصود محض خبر کو ناظرین تک پہونچانا تھا ــہ

تاب لاتے ہی بنے گی غالب
واقعہ سخت ہے اور جاں عزیز

عبدالرحمٰن کی موت[1]

پہاڑی اور پہاڑی غاروں میں پتھر کے ٹکڑوں اور سنگریزوں کی تعداد حد شمار سے خارج ہوتی ہے جنھیں انسان اور جانور ہر وقت پامال کرتے رہتے ہیں۔ لیکن ان ہی میں کوئی سنگ ریزہ لعل یاقوت بن کر نکل آتا ہے جس کی قیمت پوری ایک سلطنت کی آمدنی کے برابر ہوتی ہے اس کو اگر کوئی توڑ ڈالے تو دل پر کیا گزر جائے گی؟ سمندر میں بارش کے بے شمار قطرے ہر سال گرتے رہتے ہیں جو کسی حساب میں نہیں آتے لیکن انھیں میں چند قطرے وہ بھی ہوتے ہیں جو آغوش صدف میں پل کر موتی بن کر نکلتے ہیں اور تاج سلطانی کا زیور بنتے ہیں ان کو اگر کوئی سمندر میں پھینک دے تو دل کو کیوں کر صبر آئے گا! جنگل میں خودرو بیل اور پتے درخت اور پودے بوٹیاں اور پتیاں ہزاروں قسم کی ہوتی ہیں جو جانوروں کی غذا کا کام دیتی ہیں لیکن گلاب کی تازہ و شاداب کلی بزم ہستی کو معطر کرنے کے لئے ہوتی ہے یہ کلی اگر پھول بننے کے ساتھ ہی خزاں کی دست برد کی نذر ہو جائے تو دل کو کیا کہہ کر سمجھایا... اور قابو میں رکھا جا سکتا ہے؟

ایک چراغ جلا لیکن قبل اس کے کہ اس کا اجالا پوری طرح پھیلے، بجھ گیا! ایک آفتاب چمکا، لیکن بیشتر اس کے کہ اس کی شعاعیں پرانور پھیلائیں غروب ہو گیا۔ ایک پھول کھلا مگر معاً مرجھا گیا۔ سبزہ لہلہایا مگر فوراً خشک ہو کر زمین کے برابر ہو گیا۔ حق تو

---

[1] ۱۹ر مارچ ۱۹۲۶ء

رطلبندہوئی لیکن مخافضائے لامتناہی میں گم ہوگئی عبدالرحمٰن نگرامی نے ۲۰۔۸ برسال ہوئے
موت کے ظلمتکدہ میں اپنی آنکھیں کھولیں لیکن یہاں کی فضا کو شاید اپنے غیر موافق پاکر
مارچ ۱۹۲۶ء ۱۷ شعبان ۱۳۴۲ھ کو صبح کے وقت تعین اطلاق میں محدود وغیر محدود
مقید مطلق میں قالب بے قالبی میں جسد عالم جان میں جذب وگم ہوگیا سچ کہا ہے
کہنے والے نے کہ ہم سب اسی کے ہیں اور سب اسی کی طرف جانے والے ہیں۔

صورت از بے صورتی آمد برون
باز شد انا الیہ راجعون

میں اشکبار کہ عالم انسانیت کے اس جوہر آبدار کو اب کہاں تلاش کریں قلب مضطرب
گلستان آب وگل کے اس گوہر بے بہا کے بغیر کیوں کر آرام پائے عقل حیران کہ گلشن
ہستی کے اس گل رعنا کو کہاں سے ڈھونڈھ نکالا جائے۔ لیکن غیب کا فرشتہ آواز دیتا
کہ اس قید خانہ عنصری میں صرف اسی وقت تک کے لئے روحوں کو مقید رکھا جاتا
جب تک کہ وہ اپنی تربیت نہ حاصل کر لیں۔ عالم معنیٰ میں زمانہ کا شمار انسان کی
ہوئی جنتری اور آفتاب کی گردش سے نہیں ہوتا بلکہ روح کے لئے واپسی
وقت معزرہ دہی ہے جب وہ اپنی تربیت کی تکمیل کرے پس اگر اس پاک صفت
پاکیزہ سرشت ہستی نے جس کا ناسوتی نام عبدالرحمٰن تھا اتنی کمسنی میں تکمیل روح
سارے مدارج طے کر لئے تھے تو ٹھیک اسی وقت معزرہ پر اس کا اپنی اصل کی
طرف رجوع کرنا لازمی تھا جس پر حیرت کرنی بیجا اور تاسف کرنا بے محل ہے۔

دنیا کی ظاہر بین نگاہیں اس مرنے والے کے خط وخال سے زیادہ مانوس نہ تھیں
اگر اس مرحوم کے فضائل وکمالات کو پھیلا کر بیان کیا جائے تو یقیناً بہتوں کو
اس کا شک گزرے گا لیکن جن لوگوں کو خوش نصیبی سے ان سے ذاتی نیاز حاصل
وہی بدنصیب اندازہ کر سکتے ہیں کہ ایک ذات کے اٹھ جانے سے امت اسلامیہ کیا

کھو بیٹھے۔ ہیں مرحوم کو اس زمانہ سے جانتا ہوں جب وہ دارالعلوم ندوہ کی شاید کسی نیچی جماعت میں پڑھتے تھے۔ اور ان کی عمر ۱۵-۱۶ سے زائد نہ تھی۔ تقریر کا شوق انھیں اسی وقت سے تھا اور قیصر باغ لکھنؤ میں جب پہلی بار میں نے ان کی تقریر سنی اتنی بلند و برتر تھی کہ قدرۃً یہ بدگمانی پیدا ہوئی کہ کسی نے یہ تقریر قلمبند کر کے پیشتر سے حفظ کرادی ہے ورنہ اتنا کم سن طالب علم ایسی برجستہ تقریر کر نہیں سکتا۔ مگر جوں جوں سابقہ بڑھتا گیا یہ بدگمانی دور ہوتی گئی اور اس آئینہ کے اصل جوہر کھلتے گئے۔

ندوہ میں تعلیم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد ایک زمانہ تک سرائے میر ضلع اعظم گڑھ میں مدرسۃ الاصلاح میں اتالیقی کے فرائض انجام دیے۔ مولوی امین احسن اصلاحی جن کے مضامین سچ کی پہلی جلدوں میں بکثرت شائع ہو چکے ہیں (اسی دور کے شاگرد ہیں) مدرسۃ الاصلاح اپنے رنگ کی سارے ملک میں بہترین تربیت گاہ ہے سادہ ترین معاشرت کے ساتھ اعلا ترین علم اخلاق سے مسلمانوں کے بچوں کو آراستہ کرنا اس کا مقصد ہے۔ جناب مولانا حمید الدین صاحب مدظلہ العالی صاحب تفسیر قرآن نظم القرآن اس کے سرپرست و نگران اعلیٰ ہیں اور مرحوم ان کے بہترین رفیق و مددگار تھے۔ چھوٹے چھوٹے بچوں خصوصاً یتیم اور بے والی و وارث بچوں کو جس شفقت و محبت کے ساتھ مرحوم تربیت دیتے تھے اس کا نمونہ میری نظروں سے کم گزرا ہے۔

غالباً ۱۹۲۰ء میں مولانا ابوالکلام کی طلب پر مرحوم کلکتہ تشریف لے گئے۔ اور وہاں اس اسلامی دارالعلوم میں جو سرکاری امداد سے بے نیاز رہ کر کھولا گیا تھا صدر مدرس مقرر ہو گئے۔ اس کم عمری میں اتنی بڑی ذمہ داری کے عہدہ پر انتخاب ہو جانا اور پھر اس ذمہ داری کو بحسن و خوبی انجام دینا مرحوم کی ایک مخصوص فضیلت تھی۔ یہ زمانہ تحریک خلافت و ترک موالات کے شباب کا تھا۔ اور مرحوم نے علاوہ اپنے مشاغل تعلیم و تدریس کے ان اجتماعی و قومی تحریکات میں پوری قوت جوش و سرگرمی کے ساتھ

حصہ لیا، بکثرت تقریریں کیں، اور متعدد مضامین مسائل حاضرہ پر سپرد قلم فرمائے۔ ۱۹۲۱ء کی آخری سہ ماہی میں مولانا ابوالکلام آزاد کی سرپرستی اور مولانا عبدالرزاق ندوی کی ایڈیٹری میں پیغام نام سے ایک ہفتہ وار کلکتہ سے نکلا۔ مرحوم نے اس کے اداریہ میں ملکی آزادی کے مسئلہ کو شریعت و قرآن پاک کی روشنی میں پیش کیا۔

غالباً شروع ۱۹۲۲ء میں لکھنؤ مستقل طور پر آگئے اور دارالعلوم ندوہ نے اپنے یہاں ادیب کی خدمت پر انھیں مامور کیا۔ قرآن کا ذوق فطرت میں داخل ہو چکا تھا، ہر شاگرد کے ساتھ عزیزوں سے بڑھ کر شفقت تھی۔ متعدد شاگردوں کو ذرہ سے آفتاب بنا دیا۔ دارالعلوم ندوہ کی جو اصلی روح تھی، اسے از سر نو زندہ کر دیا اور بہت سے سینوں میں قرآن کی خدمت اور اسلام کی محبت کا سوز پیدا کر دیا۔ لکھنؤ اور جوار لکھنؤ کی ہر اصلاحی تحریک میں خلوص قلب کے ساتھ حصہ لیتے رہے، تبلیغ، تنظیم، خلافت، ندوہ، کانگریس اور ہر تحریک میں جو جماعت اسلامیہ کے لئے مفید معلوم ہوئی۔ بقدر استطاعت پوری سرگرمی کے ساتھ شرکت فرمائی۔ لکھنؤ میں ۱۹۲۴ء کے ہندو مسلم فسادات کے موقع پر اور ۱۹۲۵ء میں فتنہ شرلیعہ کے وقت خطرہ میں پڑ کر انتہائی حق پرستی کا عملی ثبوت دیا۔ ۱۹۲۵ء میں جون پور کے ہندو مسلمانوں میں صلح کرائی۔ مارچ ۱۹۲۵ء میں لکھنؤ کے اور نومبر ۱۹۲۵ء میں انبالہ کے اجلاس ندوہ میں مقاصد ندوہ پر جو اعلیٰ تقریریں ارشاد کیں وہ گویا اس وقت بھی کانوں میں گونج رہی ہیں۔ انبالہ والی تقریر غالباً زندگی کی سب سے آخری تقریر تھی۔ علالت اس وقت شروع ہو چکی تھی، تقریر بہت دیر جاری نہ رکھ سکے تھے۔ اکتوبر ۱۹۲۵ء میں رفاہ عام لکھنؤ میں توفیق شریف کی عربی تقریر کا جس برجستگی و شستگی کے ساتھ اردو ترجمہ کیا، اس نے مخالفین تک کو داد دینے پر مجبور کر دیا تھا۔

چند شوریدہ سروں کو اصلاحی پرچہ نکالنے کی ضرورت عرصہ سے محسوس ہو رہی تھی۔

۱۹۲۲ء کی آخری سہ ماہی میں مولوی ظفر الملک صاحب کی مستعدی سے یہ دشواری ایک حد تک حل ہوگئی۔ ۱۸ر نومبر ۱۹۲۲ء کو دفتر سچ میں چار شخصوں کی ایک مختصر مجلس میں تمام ابتدائی مراتب طے پا گئے اس مختصر مجلس کے ایک اہم رکن خود مولوی عبدالرحمن تھے۔ عام مقاصد سے ہمدردی و اتفاق رکھنے والے متعدد احباب تھے لیکن یہ اسی وقت نظر آگیا تھا کہ اکثر عقائد و خیالات کے جزئیات تک میں جو موافقت عبدالرحمن کو عبدالماجد کے ساتھ ہے وہ شاید کسی دوسرے عنایت فرما کو حاصل نہیں۔ اور شرکت تحریر میں جو سہولت مرحوم کے ساتھ حاصل ہوسکتی تھی اس کی توقع کسی اور سے نہیں۔ بعد کے تجربہ نے اس توقع کو حرف بحرف ثابت کر دیا ایک سال سے کچھ اوپر کے طویل سابقہ میں مرحوم کے لب و تحریر سے صرف ایک بار (جلد اول نمبر ۵ امیں ایک مضمون کے عنوان اور دواس کے بعض الفاظ سے متعلق) مجھے اختلاف ہوا اور جب میں نے اپنی اس رائے کو ان پر ظاہر کیا تو اس بے نفسی کے ساتھ جو ان کے بعد میسر کہاں اب خواب و خیال ہے انھوں نے بلا تامل و توقف میری گزارش کو تسلیم فرما لیا۔ سچ میں اپنے مضامین کے ذریعے اسلام و امت اسلامیہ کی جو خدمت وہ انجام دیتے رہے اس کی پوری روئداد ناظرین کے سامنے ہے پہلے چند ماہ سے پیروں کے درد میں مبتلا رہنے لگے تھے جسے ہم لوگ وجع مفاصل کے قسم کا کوئی مرض سمجھتے رہے اور چونکہ خود مریض نے اپنے صبر و متانت کی بنا پر کبھی مرض کی شدت نہیں بیان کی اسی لئے قدرۃً اسے معمولی اور غیر اہم سمجھا گئے۔ علاج کا سلسلہ جاری رہا لکھنؤ اور نگرام (ضلع لکھنؤ) میں متعدد اطباء کے علاج کے بعد ہر اپریل کو تغیر کے بہاں علاج و تبدیل آب و ہوا دونوں کی غرض سے تشریف لے گئے مسہل ہوئے افاقہ محسوس ہوا جیسا چہ ان کے آخری مکتوب میں انھیں کے قلم سے افاقہ کی خبر پڑھ کر سچ (نمبر ۱۸) میں نے ان کے متعلق کسی قدر اطمینان بخش نوٹ دے دیا تھا۔ اور ناظرین سے ان کی صحت کے لئے دعا چاہی تھی۔ عین اسی روز جب کہ وہ نوٹ طبع ہوا اسی صبح کو نماز فجر کے فوراً

بعد خاک کا پتلا مرض و صحت کی کشمکش سے ہمیشہ کے لئے نجات پاکر رفیق اعلیٰ سے جاملا اور اپنے تمام دینی بھائیوں پر بجائے دعاء صحت کے دعاء مغفرت کا حق قائم کر گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

دوستوں، شاگردوں اور معتقدوں کی جماعت کثیر سے قطع نظر کر کے اپنے خاص عزیزوں میں مرحوم نے ایک نوجوان بیوہ ایک خورد سال بچی اور ایک دل شکستہ ماں کو چھوڑا ہے۔ ماں کی سرگذشت خصوصیت کے ساتھ دردناک ہے۔ کم سنی میں بیوہ ہوئیں بجز خورد سال عبدالرحمان کے کوئی اولاد نہ تھی ساری ہوگی اسی نونہال کے پروان چڑھانے میں بسر کردی۔ یہاں تک کہ آخری زندگی کا بڑا سہارا بھی دغا دے گیا۔ ایمان والوں اور ایمان والیوں کے لئے بدنصیبی نہیں انتہائی خوش نصیبی ہے۔ سارے سہارے مٹ کر صرف ایک ہی سہارا باقی رہ جائے اور سب سے رشتہ ٹوٹ کر صرف ایک ہی سے رشتہ جڑا رہ جائے۔

حسن عمل اب بھی مسلمانوں سے بالکل رخصت نہیں ہوگیا ہے۔ سرزمین ہند کے گوشوں اور زاویوں میں ابھی بعض بڑے بڑے زاہدان شب بیدار موجود ہیں۔ قومی کام کرنے والوں ہی کی جماعت میں بھی ابھی چند نہایت اور مخلص اور پختہ ایمان جوان مرد زندہ ہیں لیکن اگر میری دیانت سے یہ سوال کیا جائے کہ اب تک سب سے زیادہ معصومانہ زندگی لغزشوں اور آلائشوں سے پاک زندگی، بچوں کی طرح پاک، اور بے رنگ زندگی کسی کی دیکھی ہے تو اپنی واقفیت و تجربہ کے دائرہ میں بلا تامل صرف مرحوم عبدالرحمٰن کا نام پیش کرسکتا ہوں۔ نوجوانی کے باوجود اس قدر صالح و پاکباز رہنا قومی و اجتماعی زندگی میں پوری طرح پڑ کر بھی اسقدر محتاط و بے لوث رہنا محض عطائے الٰہی و لطف خداوندی کا حیرت انگیز کرشمہ تھا۔ ذٰلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔

وہ صحیح معنوں میں مسلم مومن تھے۔ اسلام کی حقیقت ان کے دل کی گہرائی میں اتری ہوئی تھی اور یہی وجہ تھی۔ کہ ان کی صحبت ان کی تقریروں سے بھی زیادہ موثر ہوتی

تھی۔ اللہ پاک کا ہر وقت بھروسہ رہتا تھا۔ ذات مبارک نبوی کے ساتھ دلی شیفتگی تھی۔ جستجو و طلب، صحابہ کرام کا دین فطرت کی تھی۔ متاخرین کے زوائد اور رنگ آمیزیوں سے دلچسپی نہ تھی۔ ملکی و سیاسی آزادی کے لیے بے چین رہتے تھے اس لئے کہ ان کی بصیرت کو قرآن کریم سے اس کے احکام ملتے تھے۔ دینی خدمت کی ہر صنف اور ہر صورت کے لئے ان کی زندگی وقف تھی تقریر و تحریر کے علاوہ اگر کوئی موقع جہاد بالسیف کا آملتا تو اس میں بھی ان کا قدم کسی سے پیچھے نہ رہتا جزئیات عقائد میں بڑا داری خاص مسلک تھا بجائے کسی خاص فرقہ کی جانب زیادہ جھک جانے کے اپنا انتساب محمد رسول اللہ کے لائے اسلام ہی کی جانب پسند فرماتے تھے۔ شان رحماء بینہم کو پوری طرح نباہا عقائد و خیالات میں اپنے بڑے سے بڑے مخالف کے لئے ہی ہمیشہ نرم سے نرم تاویل پسند فرمائی ذاتی دشمن ہر شخص کے ہوتے ہیں میرے تجربے میں ان کی شخصیت اس کلیہ سے مستثنیٰ تھی۔ میں نے ان کا کوئی دشمن نہیں دیکھا۔

وہ صحیح معنی میں درویش تھے گو کبھی اپنی درویشی کی نمائش نہیں کی۔ صبر و ضبط فطرت ثانیہ بن گئے تھے ماسوائے اللہ بے تعلقی و بے نیازی زندگی کا جز تھی۔ بڑی سی بڑی ترغیب نے بھی کبھی پائے ثبات میں لغزش نہیں پیدا کی۔ بار ہا بڑے بڑے کٹھن وقت پڑے اس کا پتہ خاص خاص دوستوں تک کو نہ چلنے دیا۔ کلکتہ کے زمانہ قیام میں ایک مدت تک معاش کی یہ عسرت رہی کہ گویا نیم فاقہ کشی تھی۔ یہ سارا زمانہ ہنسی خوشی گزار دیا۔ لب کبھی حرف شکایت سے آشنا نہ ہوئے۔

سنہ ۱۹۲۴ء میں ایک سرکاری یونیورسٹی کی طرف سے علوم اسلامیہ کی پروفیسری کے لئے تحریک ہوئی مشاہرہ جس قدر ندوہ میں پا رہے تھے اس سے بقدر چھ گنے سے زائد تھا۔ شہرت و ناموری وغیرہ اس پر مستزاد۔ اللہ کے اس نیک بندے نے بے تامل اس دعوت کو مسکرا کر ٹال دیا بلکہ اپنے خاص رفیقوں اور دوستوں سے بھی اس کا ذکر

نہ کیا! قناعت استغنا ایثار یہ الفاظ سننے میں بار بار آتے ہیں۔ دیکھنے میں ان کا پورا
زمرف عبدالرحمٰن کی ذات میں آیا تھا۔

وہ صحیح معنی میں متقی تھے۔ زبان، آنکھ، کان اور دل سب کو بدی، بدکاری و بدخیالی
ے روکے ہوئے تھے۔ حلم و تحمل خمیر میں داخل تھا۔ سخت سے اشتعال کے موقع پر بھی برہم
نہیں ہوتے تھے۔ اپنے طویل سابقہ میں غصہ آتے میں نے ایک موقع پر بھی نہیں دیکھا
لوں پر شفقت، محتاجوں کی خبر گیری، بے کسوں کی امداد کے بغیر زندگی محال تھی۔ انکسار
و فروتنی، ہر ادنیٰ و اعلیٰ کے مقابلہ میں برتتے تھے۔ بڑوں کے ادب و لحاظ اور چھوٹوں
محبت و الفت سے کسی گھڑی خالی نہ تھے۔ نفل نمازیں پڑھتے تھے مگر چھپ کر روزے
کثرت رکھتے تھے مگر راز بنا کر۔ بے لوثی اور بے نفسی، انتہا کو پہونچی ہوئی تھی خودداری
جدید مفہوم (خودی، خود بینی و خود نمائی) سے بالکل ناآشنا تھے۔ ساری زندگی اطاعت
ادت تقویٰ و طہارت میں گزاری مگر کبھی اپنی مذہبیت، پاکبازی و تقدس کی تجارت
ی، قومی و اجتماعی زندگی میں پوری طرح پڑنے کے باوجود بھی کبھی آگے بڑھنے کی اور
رنے کی کوشش نہ کی، یہ آزمائش بھی ہر واقف کار پر روشن ہے کہ کوئی معمولی بات نہ

دل کی ان ساری فضیلتوں کے ساتھ دماغ بھی ممتاز لے کر آئے تھے۔ صحیح معنی میں
و طالب علم تھے۔ علمی مصروفیتوں سے ایک لمحہ فرصت نہ تھی۔ علوم میں سب سے زیادہ دلچسپی
پی کی چیز کسی انسان کی نہیں، اللہ کی کتاب حکیم تھی۔ خاص شغف و انہماک اسی
سے تھا لیکن اس کے علاوہ بھی سارے دینی و مذہبی ذخیرہ ادبیات پر گہری اور وسیع
تھی۔ خدمت دین کے غرض سے انگریزی بھی بقدر ضرورت پڑھ لی تھی حالات حاضرہ
ری طرح باخبر رہنے کے لئے بہ کثرت اخبارات و رسائل کا مطالعہ برابر رہتا تھا
میں سادہ تھا حسن ترتیب حسن بیاں سلاست زبان ذوق انشاء کی شہادت

ان کے قلم کی نکلی ہوئی ہر سطر دے رہی ہے۔

الفاظ میں نہیں کہا جا سکتا کہ اس نادر شخصیت اس جامع کمالات، اس حیرت انگیز
عمل کی وفات سے امت اسلامیہ نے کیا کچھ کھو دیا۔ بہرحال تقدیر الٰہی پوری ہو کر رہی او
بجز صبر و شکر کے اب کسی کے پاس کوئی چارہ کار باقی نہیں۔

پچھلے سال اسی مبارک مہینہ کے آغاز میں مجھے مرض قلب کے متعلق ایک بہت سخت
دورہ پڑا تھا معلوم ہوتا تھا کہ حرکت قلب فوراً بند ہوا چاہتی ہے اس وقت میں نے ایک مختص
وصیت نامہ تحریر کیا تھا اس کی دفعہ ۲ یہ تھی کہ میری تجہیز و تکفین، نماز جنازہ وغیرہ جہاں تک
ممکن ہو منجملہ اور دو تین صاحبوں کے، مولوی عبد الرحمٰن کے ہاتھوں انجام پائے۔ رفیق
کی رفاقت اعلا کے اختیار کرنے پر حریص عبد الرحمٰن! جس شخص کو تمھارے خلوص، تمھا
برگزیدگی تمھارے ایمان پر اس درجہ اعتماد تھا کیا خبر تھی کہ تم اس قدر جلد اسی کے اعتماد
شکست کر دو گے اور کون کہہ سکتا تھا کہ اسی بدنصیب کو آہ! تمھاری تعزیت و ماتم م
اشکبار ہونا پڑے گا۔

بیوہ اور مصیبت زدہ ماں کے اکلوتے فرزند عبد الرحمٰن! جس ماں نے اپنی
بیوگی اور پھر کم سنی کی بیوگی کی گھڑیوں کو دیکھ دیکھ کر پار کر دی، اور جس نے اپنی ساری خوش
اور آرزوؤں، حوصلوں اور ارمانوں کا مرکز تمھارے گھرشے کو رکھا آج اسی دکھیاری کے
کلیجہ کے ٹکڑے کس طرح کٹ کٹ کر اس کی آنکھوں سے بہہ رہے ہیں! کیا یہ حسرت وہ اپنے
ساتھ قبر ہی میں لیجائے گی کہ ایک بار تم اپنے ہاتھ سے اس کے آنسو آکر پونچھ دو۔ اور
یاں ایک عصمت مآب پردہ نشین کے ہاتھوں کی چوڑیاں ٹھنڈی کر دینے والے عبد الرحمٰن
جس دُلاری کو تم اس کے ماں باپ سے چھڑا کر وطن سے بے وطن کر کے اس کے بچپن کی
سہیلیوں سے جدا کر کے اس کا ڈولا بڑے شوق و ارمان سے اپنے ہاں لا کر اتارا تھا
جس کا لباس عروس ابھی میلا نہیں ہونے پایا تھا اور جس حسرت نصیب کو آخری د

تمھاری خدمت کا موقع بھی نہ مل سکا آہ آج اس کے دل پر کیا گزر رہی ہے! کیا اب بجز
حشر کے اب تمھارا دیدار اسے نصیب نہ ہوگا۔؟

معصوم بچی کے معصوم والد عبدالرحمٰن تم تو غیر دل کے یتیموں کو اپنی اولاد سے بڑھ کر
سمجھتے تھے آج خود تمھاری ننھی معصوم تمھارے غم میں کیسا بلک رہی ہے کیا اس کے سر پر
بھی وہی ہاتھ پھیرے گا جو یتیموں اور غم زدوں بےکسوں اور بے وارثوں سب کا حقیقی
والی وارث ہے۔؟

عزیزوں سے بڑھ کر عزیز، مخلصوں سے بڑھ کر مخلص عبدالرحمٰن! اپنے ایک
گنہگار اور شکستہ بھائی کی جانب سے سلام و رحمت مغفرت و رحمت کی بے گنتی اور دل
سے نکلی ہوئی دعاؤں کا ہدیۂ حقیر قبول کر، تمھاری آنکھوں سے آج پردے اٹھ چکے ہیں
عبادت سے گزر کر آج تم معنی و حقیقت کے محرم اسرار ہو چکے ہو جمال سرمدی کے لئے
حجاب نظارہ سے تم آج شاد کام ہوئے ہوئے ہو تمھیں ان خوش نصیبوں کا واسطہ
بے نیاز کی حریم ناز میں شرف باریابی حاصل کر چکے ہو اس کی عظمت و کبریائی کا
صدقہ کہ لَهُمْ مَا يَشَاءُونَ عِنْدَ رَبِّهِمْ کے مرتبہ پر فائز ہو کر اور راضیۃً مرضیۃً
خلعت سے سرفراز ہو کر اور لهم ما یشاؤن فیها ولدینا مزید کے انعامات سے مالا مال
اپنے گنہگار اور بد نصیب بھائیوں کو بھول نہ جانا اور اللہ کی یکتائی نے دبانی افراد
والوں کے حقوق کو فراموش نہ کر جانا۔ دنیا نے تمھیں اگر نہیں پہچانا تو معذور تھی اہل
اگر تمھاری قدر و قیمت کا اندازہ نہیں کر سکی تو کچھ ہرج نہیں جس سے تم کو اور ہم کو
آخری اور دائمی سابقہ پڑنے والا ہے وہ تو بہر حال بے خبر نہیں۔ کل من علیہا
فان و یبقیٰ وجہ ربک ذو الجلال والاکرام

زلظیری زنگ آمدہ بودی چو مسیح
باز بس رفتی و کس قدر تو نشناخت دریغ

ہمنام نامور[1]

سنہ عیسوی کا آغاز تھا کہ قوم کا ماتم کرنا پڑا ، خدائے قوم محمد علی کا داغ سہنا پڑا۔ ابھی سنہ ہجری ختم ہو رہا ہے کہ محمد علی کے دوست، محب عبدالماجد بدایونی یک بیک اور دفعۃً اپنے سب اور یادیں رفیقوں کو چھوڑ چھاڑ کر اس بیوفا دنیا سے منہ موڑ کر رفیق اعلیٰ سے جا ملے، سنتے چلے آئے تھے کہ آغاز اور انجام میں ایک رشتہ ہوتا ہے اور اول آخر نسبتے دارد۔ کسے خبر تھی کہ جو سال شروع یوں ہوا تھا وہ ختم بھی یوں ہو گا! اور کون کہہ سکتا تھا کہ ملت کے حق میں یہ پرانی ضرب المثل اپنے اس دردناک معنی میں صادق آکر رہے گی۔

شعبان ۱۳۴۹ھ آیا تو ماتم اس کا کرنا پڑا، جو تحریک خلافت کا بانی و علم بردار تھا، شعبان ۱۳۵۰ھ کا آیا تو زخم اس کا اٹھانا پڑا جو اس وقت خلافت کمیٹی کا صدر تھا! کہنے

[1] سچ لکھنؤ ۱۹۳۱ء

ہیں کہ اس ماہ مبارک میں ایک شب مبارک ایسی آتی ہے جس میں سال بھر کے لئے افراد اقوام
کی قسمتوں کا فیصلہ صادر ہوتے ہیں۔ کیا ہم شوریختوں کی قسمت میں اب لیلۃ البرات کے معنی
صرف نالہ وفغاں دیتیمی وبیوگی حسرت وحرماں، غم والم شیون ماتم کے رہ گئے ہیں؟ نہیں شعبان
کسی کے اپنا مہینہ کہہ کر پکارا ہے۔ شعبان شہری خلعت سے سرفراز کیا ہے اسے سال
کے سب مہینوں سے محبوب تر قرار دیا ہے وکان احب الشہور الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
شعبان۔ ابوداؤد۔ حق ہے کہ اُس آقا کے سرفروش غلام اس مہینے کو اپنے لئے اختیار کریں
اور اس شمع کے پروانے اپنی اپنی جان کے نذرانے اسی محبوب زمانہ میں لے کر آگے بڑھیں!

مرحوم بدایوں کے مشہور ومعزز پیرزادوں کے خاندان سے تھے۔ ناز ونعمت میں پرورش
پائے ہوئے ابتداء سے خاصی امیرانہ زندگی کے خوگر، خوش پوشاک، خوش خوراک دو مردوں کو کھلا
کر کھانے والے۔ تحریک خلافت میں شریک ہوتے ہی سارا معیار زندگی بدل دیا۔ اور معاشرت
بالکل سادہ بلکہ مفلسانہ کر دی۔ جیل نہیں گئے لیکن جیل پہونچنے کی کوشش میں کوئی کسر بھی
نہیں اٹھا رکھی اور ایک عمر کی عادتوں کو دفعۃً ترک کر کے درویشانہ زندگی اختیار کر لینے کا
مرتبہ بھی جیل جانے کے مجاہدے سے کم نہ تھا۔ خلافت، جمعیۃ علماء، تبلیغ، تنظیم، مسلم کانفرنس
اور آخر میں پھر خلافت جس جس تحریک میں شریک ہوئے دل لگا کر شغف انہماک مستعدی سرگرمی سے شریک ہوئے جس کام میں
لگ گئے گویا اسمیں جان ڈالدی۔ زندگی کے آخری ۱۰-۱۲ سال کا ہر گھنٹہ بلکہ کہنا چاہیے ہر منٹ قومیات کے لئے
وقف تھا۔ سکون وراحت کا کوئی زمانہ نہ تھا۔ مسلسل علالتوں اور پیہم خانگی صدمات کے
باوجود کام کے پیچھے دیوانے تھے۔ اور ایک جگہ بیٹھنا تو جانتے ہی نہ تھے۔ تیز بخار چڑھا
ہوا اور مجاز کی کانفرنس کے اہتمام میں مصروف، سینہ میں درد ہو رہا ہے اور امین آباد
کی محفل میلاد ڈھائی ڈھائی تین تین گھنٹہ تک بیان کر رہے ہیں۔ شانے میں ورم، ہاتھ
جھولے میں پڑا ہوا لیکن یہ کیسے ممکن کہ مجلس تنظیم کی مجلس عاملہ میں شرکت نہ ہو۔ ع والتماجد

نزع میں اور مولانا کانپور میں تقریر کررہے ہیں. بھوکی آخری سانسوں کی اطلاع آرہی ہے اور آپ ہیں کہ دہلی کی جامع مسجد میں خود رو رو کر دوسروں کو بھی رلا رہے ہیں. کل لکھنؤ میں تھے آج کلکتہ پہونچ گئے عید کا چاند لاہور میں دیکھا تھا نماز کو میرٹھ میں پڑھی. صبح پٹنہ میں شام کو معلوم ہوا کہ دکن کے راستہ میں ہیں! عجیب وغریب مستعدی بھی عجیب تر تھی.

تحریک خلافت کے، کم ازکم اپنے صوبے میں تو شاید سب سے بڑے پرجوش مبلغ علمبردار رہے مدتوں صوبہ خلافت کمیٹی کے صدر بھی رہے جمعیۃ العلماء کے اجلاس اجمیر والے مارچ ۱۹۲۲ء میں جو ہنگامہ خیز تقریر کی تھی اس کی گونج گویا اب تک کانوں میں سمائی ہوئی کانگریس سے بھی ایک زمانہ میں ہاتھوں ہاتھ لیا تھا. اس کی مرکزی کمیٹی کے ممبر تو بہرحال تھے غالباً اس کی مجلس عاملہ کے رکن بھی رہے. اور تحریک تنظیم ۱۹۲۴ء و ۱۹۲۵ء والی تو جب زندہ رہی بڑی حد تک انھیں کے دم سے جیتی رہی. مسیح الملک اجمل خاں مرحوم اور رئیس محمد علی دونوں ہی سے بڑے گہرے اور مخلصانہ تعلقات تھے شاید انھیں سے ملنے کی تھی جو وہ مضطرب روح سب کو چھوڑ کر اپنے آخری سفر پر روانہ ہوگئی.

٭ ٭ ٭

لکھتے اچھا تھے متعدد رسائل ومضامین اپنی یادگار چھوڑے ہیں. لیکن جیسا تھے اس سے کہیں بہتر بدرجہا بہتر چند در چند بہتر بولتے تھے. تقریر اور موثر تقریر پر کر سکتے تھے اور سیاسی اور عام مذہبی عنوانات پر بھی دلوں کو ہلا دیتے اور مجلس کو رلا دیتے تھے لیکن اصل ذوق اور فطری شوق کی چیز محفل میلاد تھی جبیب رب العالمین کا ذکر پاک کرنے اٹھتے تو اپنے آپ میں نہ رہتے بلبل کی طرح بولتے اور چہکتے اور رقاص کی طرح جھومتے اور لچکتے. خطابت لپٹ لپٹ کر بلائیں لیتی اور خوش بیانی مست ہو منہ چومتی. ایک ایک فقرہ معلوم ہوتا تھا کہ عشق ومحبت کے سانچے میں ڈھلا ہوا ایک جملہ نظر آتا تھا کہ سوز وگداز کے عطر میں بسا نکلتا چلا آرہا ہے! فصاحت وبلاغت

ہتا کہ آبلا پڑتا ہے۔ کیا ربیع الاوّل میں جنّت کی حوروں اور آسمان کے فرشتوں کو بھی
کا شوق ہوا ہے کہ جس کے مرتبہ سے وہ خوب واقف ہیں اس کی نعت ایک خاکی کی
سے بھی سنیں ؟

ایک زبردست وخوش عقیدہ صوفی تھے فاذرتیت توحد توغل کہ پہونچی ہو ہر بود گ
ب خاص اکابر چشتیہ کے حلقہ بگوش بزرگان دیوبند سے صاف نہ تھے لیکن حضرت
البنڈ کے پوری طرح معتقد بڑے ذہین بڑے ذکی شوخ وطباع بڑوں کی عظمت کرنے
ے چھوٹوں پر شفقت کرنے والے۔ متواضع وخوش اخلاق، فیاض ومہمان نواز شودمعقول
مت یہ تھا کہ جس سے ملتے کھل کر ملتے۔ دل سے ملتے تکبر سے دور تمکنت سے نفور پہلی
قات میں بے تکلف ہو جاتے اور اپنے اعزاز ووقار کی ذرا پروا نہ کرتے۔ جس کے دوست
تے آخر تک ساتھ دیا حق نباہ دیا۔ وضعدار ایسے کہ دوستوں اور دوستی کے اور پ
ان کر دیا۔ لڑتے تو معاف کرنے پر تیار ہو جاتے، روٹھتے تو بخشنے میں دیر نہ کرتے۔ دوستوں
ناذر الجلد ہو جاتے خوش جلد ہو جاتے۔ ہمدردی ہر مسلمان کے ساتھ کرتے اور خدمت
چھوٹے بڑے کی کمربستہ رہتے۔ لکھنؤ میں ایک مرید کے ہاں شادی کی تقریب تھی خود دوڑ
کر مہمانوں تک کھانا پہونچاتے اور مستعد ہو کر مریدوں سے بڑھ کر کام کرتے تھے۔

مرنے والے! اپنے مالک ومولا کے حضور میں جا اور اپنے ادنیٰ وگمنام ہمنام کا آخری
م لیتا جا۔ تو نے اپنے وطن سے دور مسافرت میں موت پائی، اور تیرے سچے سردار نے
وت کو شہادت کی موت فرمایا ہے۔ تیرے نامور آقا نے اپنا سفر آخرت دوشنبہ
ج کو اختیار کیا تھا تیرا رخت سفر بھی اس سے کچھ ہی قبل شب دوشنبہ میں بندھا۔
خوش نصیبی میں کیسے شبہ؟ لیکن یہ تو تھا کہ تو دوسروں کے بچوں پر رحیم وشفیق تھا
تو تیرے کمسن بچوں اور بھتیجوں کے سر پر ہاتھ کون پھیرے گا؟ تیرا دردمند دل
ی اعانت کے لئے تڑپ جاتا تھا۔ آج خود تیری لٹی اور اجڑی ہوئی بیوہ کی غمگسار ی

کون کریگا؟ تو ہر مسلمان کے حق میں قوت بازو تھا آج خود تیرے بھائی کے مجروح دل پر کون مرہم رکھے گا؟ تو قوم کے دھندوں سے کسی وقت خالی نہ تھا اب اس بیڑے کی ناخدائی کون کریگا؟ — ہاں وہی کریگا جو تیری طرح فانی نہیں! باقی ہے، عہد نہیں رب ہے، بے لغزش ہے، قادر ہے، جو ہر یتیم کے حق میں باپ سے کہیں بڑھ کر شفیق، ہر بیوہ کے لئے شوہر سے کہیں بڑھ کر غم گسار، ہر مسلمان کے لئے بھائی سے کہیں بڑھ کر سامان تقویت اور قوم کے حق میں سردار قوم سے کہیں بڑھ کر ناصر و حافظ ہے . . . . جو ان کا سہارا ہے جن کا کوئی سہارا نہیں اور جو جس خاک کے پتلے سے جب تک جو کام چاہتا ہے لیتا رہتا ہے اور جب چاہتا ہے اپنے حضور میں واپس بلا لیتا ہے۔ بقا ہے تو اسی کی ذات کو اور دوام ہے تو بس اسی کے نام کو!

سید الطائفہ

مولانا سید سلیمان ندوی[1]

(۱۸۸۴ء - ۱۹۵۳ء)
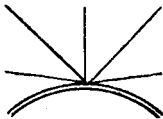
نومبر ۱۹۱۴ء میں جب مولانا شبلی کا مختصر علالت کے بعد ان کے وطن اعظم گڑھ میں انتقال ہو گیا تو ہم لوگوں کا مختصر سا قافلہ بے سالار رہ گیا۔ مولانا حمید الدین فراہیؒ سن و سال علم و فضل میں زہد و تقویٰ میں سب سے بڑھے ہوئے تھے اور اس پر مولانا کے عزیز قریب بھی۔ لیکن اول تو ان کا قیام حیدرآباد میں کشتی در حیثی ملاح در فرنگ کا مصداق اور پھر اسی چھوٹی سی ٹولی میں سب دینہار و متقشف ہی نہ تھے بعض بددین بلکہ بعض مجھ جیسے بے دین بھی شامل تھے۔ ان کے ساتھ مولانا فراہیؒ کے نباہ کی کوئی صورت نہ تھی رہے مولانا ابوالکلام تو ایک تو وہ بھی صدہا میل کے فاصلہ پر کلکتہ میں اور پھر اس وقت سونی صدی سیاسیات میں پھنسے ہوئے۔ ان دونوں ہستیوں کے خارج از بحث ہو جانے کے بعد قرعہ انتخاب سب کا بالاتفاق شبلی کے فاضل ترین و قابل ترین شاگرد و سید سلیمان ندوی بہاری کے نام پر پڑا اور جانشینی کا تاج سب نے ہاتھوں ہاتھ انھیں کے سر پر رکھا۔

میکشوں کے سر پہ یارب پیر میخانہ رہے

سلیمان "پیر" ہوں یا نہ ہوں بہرحال "پیر میخانہ" کی صلاحیت سب سے زیادہ رکھتے تھے۔ پٹنہ میں سرکاری کالج میں لکچرر تھے آئندہ ترقیوں اور بیش قرار مشاہرہ کے حقدار تھے سب چھوڑ چھاڑ کر آ گئے اور استاد کے آستانہ پر جم کر بیٹھ گئے۔

---

[1] صدق جدید ۴ دسمبر ۱۹۵۳ء

نومبر ۱۹۱۴ء کا زمانہ ہے اور اعظم گڑھ کا مقام شہر کی آبادی سے الگ ایک نہایت وسیع احاطہ کے اندر ایک بھوس کے بنگلہ میں، ۵۷ سال کی عمر کا ایک مریض اور اپنی عمر سے کہیں زیادہ بوڑھا اور زندگی سے مایوس شدید کرب کی حالت میں تڑپ رہا ہے اور پہلو میں بیٹھے ہوئے اپنے عزیز شاگرد و تیماردار کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر ادھ کٹے لفظوں میں کچھ وصیت کر رہا ہے۔ وصیت اپنے مال و جائداد خاندان و اعزہ سے متعلق نہیں دنیا سے رخصت ہوتے دھن کچھ اور ہی سر پر سوار ہے ذرا کان لگا کر سنیے۔

"سلیمان ...... سیرت ...... سب کام چھوڑ کر سیرت"

یہ وصیت کرنے والا تھا مشہور فاضل اور اردو کا نامور ادیب و اہل قلم شبلی نعمانی جس کو آخر میں کئی سال سے لگن تھی تو ایک اعلیٰ سیرۃ نبوی کی اور وصیت سننے والا تھا اس اُستاد کا ہونہار ترین شاگرد سید سلیمان، سلیمان اس وقت جوان تھے کوئی ۲۹، ۳۰ سال کی عمر کے اور کس جوان کے دل میں دنیوی ترقیوں کے ارمان اور مالی خوشحالی کے حوصلے نہیں ہوتے؟ مرنے والے کی وصیت کو سنا ظاہری کانوں سے نہیں گوش دل سے سنا اور تعمیل اسی طرح کی کہ شاید استاد مرحوم خود بھی اسی طرح تعمیل نہ کر پاتے، رفیقوں جلیسوں نے سید الطائفہ کہہ کر پکارا اور خانقاہ شبلی کے اس جنید پر لقب پوری طرح چپا کر رہ گیا۔

سیرۃ النبی (جلد اول تا ششم) کے اس ضخیم و عظیم الشان کارنامہ کی مثال اردو یا کسی اور زبان میں تو کیا ہوتی عربی میں بھی ملنا مشکل ہی ہے۔ مولانا شبلی بیچارہ تو صرف اس کے ابتدائی حصے لکھ سکے تھے اور نظر ثانی ابھی اس کی باقی تھی۔ سیرۃ کلیہ کارنامہ کہنا چاہیے کہ سلیمانی ہی کارنامہ ہے اور شبلی کا نام بطور تبرک ہی کے شامل ہے سلیمان کا یہی کارنامہ انھیں سلیمان اعظم بنا دینے کے لیے کافی ہے زندگی بھر وہ کچھ اور نہ کرتے اور یہی اپنی یادگار چھوڑ جاتے جب بھی ان کا نام نامی رہتی دنیا تک روشن رہتا۔

. رسول کریمؐ کے ممتاز سیرۃ نگاروں کی صف اول میں انھیں جگہ ملتی اور حشر میں اپنے جدّ اعلیٰ کے نگاہ کرم و شفقت کے روبرو بیہقی اور قسطلانی اور زرقانی کے زمرہ میں وہ بھی محشور ہوتے لیکن سیرۃ النبی کے جلو میں تو ایک پورا لشکر ہی ہے۔ رحمتِ عالم اور ارض القرآن سیرتِ عائشہؓ اور خطباتِ مدارس نقوش سلیمانی اور خیام عرب و ہند کے تعلقات حیات شبلی، لغاتِ جدیدہ اور عربوں کا فن جہاز رانی۔ چھوٹی بڑی نئی پرانی، دینی علمی، ادبی، درجنوں کتابوں کے مصنف اور بے شمار مقالات کے راقم کو کوئی اردو خواں بھلانا چاہے بھی تو کیسے بھلا سکتا ہے؟

اپنی پچاس سالہ تصنیفی زندگی میں ادب صالح سے اردو کے ذخیرہ کو جتنا مالا مال اس مرنے والے نے کیا ہے اس سے بڑھ کر اور کون کر سکا ہے۔؟

شبلی منزل کا لب مرگ مکین دیکھ رہا تھا کہ بات بگڑی جا رہی ہے۔ کام کے ساتھ ساتھ کام کی حسرتوں کا ایک انبار اپنے پیچھے چھوڑے جا رہا ہے۔ سعادت مند شاگرد نے گرتا ہوا علم تھام لیا۔ جو بات بگڑ چلی تھی دم کے دم میں بنا لی۔ کام کرنے والوں کے ایک نظام دار المصنفین کا تو خاکہ ہی خاکہ آیا تھا مرحوم کے ذہن میں تھا حوصلہ ہی حوصلہ تھا اور کاغذ پر ابھی نقشہ ہی تیار ہو پایا تھا۔ عمارت ساری کی ساری تو سلیمان ندوی ہی نے تیار کر دی اور اپنے ندوی ہونے کا حق ادا کر دیا۔ ۱۵ء ہی سے دار المصنفین کا باقاعدہ ادارہ قائم کر دیا اور الندوہ کا جانشین نہیں نعم البدل معارف کے نام سے جاری کر دیا ادارہ اور رسالہ نے ۳۵، ۳۶ سال کے عرصہ میں جو کچھ کر دکھایا اس کا تعلق ان سے نہیں حال سے ہے خبر سے مشاہدے سے ہے خنید سے نہیں دید سے ہے۔ اسلامی ادبیات کے اتنے ذخیرۂ عظیم کی سعادت اسی خوش نصیب کے لیے مقرر ہو چکی تھی۔

۲۰ء سے جنگ عظیم اول کے خاتمہ کے بعد علمبرداران امن کی پوری یورش

خلافت پر شروع ہوئی ہے ترکی کا "مرد بیمار" خلیفۃ المسلمین ہر طرف ترغہ میں ہے
اور شاطران سیاست کی کوشش ہے کہ جنگ میں شکست کے بعد خلیفہ کے پاس بچا کھچا جو
کچھ رہ گیا اسے بھی شرائط صلح کے بہانہ سے ہتھیا لیا جائے۔ محمد علی کا قلب مومن ہر مومن
کی طرح اس وقت بھی تڑپ اٹھا اور خلافت کمیٹی نے جو ایک آدھ سال قبل قائم ہو چکی
تھی ان کی صدارت میں ایک وفد یورپ بھیجنا طے کیا لیکن مسلمان کا اصل مطالبہ مذہبی
تھا نہ کہ سیاسی سوال یہ اٹھا کہ اسلامی ہند کی دینی اور مذہبی نمائندگی وفد میں کون کرے
ہندوستان کے علماء میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی تحریک میں سب سے پیش پیش تھے
لیکن وہ اس سفر سے معذور سب کی نگاہ بالاتفاق سلیمان ندوی ہی پر پڑی اور وہی اس
وفد میں دینی رکن کی حیثیت سے شریک ہو کر یورپ روانہ ہوئے۔ اور وہاں نہ صرف
مناسب موقعوں پہ تقریریں کیں بلکہ انگریزی پریس میں جو زہر افشانی ترکوں کے
خلاف ہوتی رہی اس کے جوابات بھی تاریخی اور فقہی حوالوں سے مدلل و مستند انگریزی کا
ترجمہ کرا کے دیتے رہے۔ اکبر الہ آبادی کے یہ شعر اسی زمانے کے ہیں ؎

سلیمان کی بات کیسی بنی — وہ ندوی سے اب ہو گئے لندنی
رہے بادہ نوشوں سے بیٹک کھنچے — مگر چائے والوں سے گاڑھی چھنی
محمد علی کی رفاقت نہیں ہیں — خدا خیر سے ان کو کر دے غنی

اور وفد جب لندن سے پیرس پہنچا تو اس وقت اسی پیر ظریف نے فرمایا ؎

دعائیں کر رہے ہیں ہم یہاں مسجد کی دریوں پہ
مبارک ہو سلیمانی نظر پیرس کی پریوں پہ

جانشین شبلیؒ گوشہ نشین اور محض کتاب نویس نہ تھا۔ سیاسیات کا بھی مرد
میدان تھا خلافت کی مجلس انتظامیہ و مجلس عاملہ میں مدتوں شریک رہے۔

اپریل ۱۹۲۶ء ہے حجاز سے شریفی خاندان کی حکومت ختم ہوئے عرصہ ہو چکا ہے اور اب تسلط سلطان عبدالعزیز ابن سعود کا ہے۔ ہندوستان کی خلافت کمیٹی سے ان کے بڑے بڑے وعدے تھے لیکن اب ان کے ایفاء کا امکان دور ہی ہوتا جا رہا تھا اس نے ایک خاص جوش و ہیجان سارے ملک میں پیدا کر دیا تھا۔ بہر حال وہاں ایک عالم اسلامی کی موتمر یا کانفرنس منعقد ہو رہی تھی اور اس میں شرکت کی دعوت خلافت کمیٹی کو بھی موصول ہو چکی تھی۔ وفد میں انتخاب علی برادران اور شعیب قریشی کا ہوا اور اب گفتگو یہ تھی کہ رئیس وفد کون ہو؟ حکیم اجمل خاں مرحوم نے اٹھ کر نام سید صاحب کا پیش کر دیا اور معاً ساری گفتگو ختم تھی ان سے بہتر رئیس وفد حجاز اور ہو کون سکتا تھا عربی میں آزادی اور پوری قدرت کے ساتھ کیا گفتگو اور کیا تقریر اور پھر دینی مسائل پر ان سے بہتر اور کون کر سکتا تھا؟ — پھر یہ سفر بھی ان کے لیے نیا نہ تھا۔ دو ایک سال قبل جب شریفی، سعودی تصادم شباب پر تھا جب بھی تو وہ وفد خلافت ہی کے رکن کی حیثیت سے جا چکے تھے۔

آخر آخر میں تصوف بہت غالب آگیا تھا۔ حکیم الامت و امام طریقت تھانوی کا آخری زمانہ تھا کہ ان سے عقیدت پیدا ہوئی اور والہانہ حد تک پہنچ گئی۔ بیعت ہوئے اور مرشد انور میں ایسا جذب ہوئے کہ ایک لفظ فنا فی الشیخ جو مدت سے سننے میں آ رہا تھا۔ اس کو عملی نمونہ پیش کر دیا۔ تصنیفی تحریری، تقریری یہ سارے ذوق کم ہوتے گئے اور اسی نسبت سے وقت اوراد و اذکار کی نذر ہونے لگا۔ نیند طبعی طور پر زائد تھی لیکن ہم بے تکلف قدیم نیاز مندوں کو دیکھ کر حیرت ہو گئی کہ اسی بن کو پہنچ کر اس پر پوری طرح قابو پا لیا اور شب بیداری کوئی بات ہی نہ رہ گئی۔ خدا ترسی نرم مزاجی تواضع، فروتنی پہلے ہی سے تھی اور مروت کے تو گویا پتلے ہی تھے۔ تصوف

کے اثر نے کہاں سے کہاں پہنچا دیا آخر عمر میں صدمات بھی کچھ ایسے برابر پہنچتے رہے جن کا مقصود تکوینی انانیت شکنی اور نفس میں شکستگی تضرع وابتہال کی کیفیت پیدا کر دینا تھا اور اس پر حیرت ذرا بھی نہ کیجئے کہ رسولؐ کا یہ سیرت نگار اور دین کا دیرینہ خادم جب ۸۰ سال کی عمر میں ۲۲ نومبر ۱۹۵۳ء کو اپنے وطن حقیقی کو روانہ ہوا ہے تو نماز مغرب پڑھے ہوئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی اور عالم ناسوت میں جو بالکل آخری عمل، قصد و اختیار سے ہوش و حواس میں صادر ہوا ہے وہ عمل نماز ہی تھا۔

مفتی صاحب

●

دلی کی خبر ہے کہ عین جس وقت سال عیسوی رخصت ہو رہا تھا ۳۱ دسمبر اور یکم جنوری کی درمیانی شب میں (شب پنجشنبہ) کو مفتی صاحب نے رحلت فرمائی۔ انا للہ کون مفتی صاحب مفتی کفایت اللہ صاحب سابق صدر جمعیۃ العلماء...... آج سے ۲۵، ۳۰ سال قبل جب خلافت کمیٹی کا زور و عروج تھا۔ مطلق مفتی صاحب سے مراد یہی مفتی شریعت ہوتے تھے۔ نام لینے کی حاجت بھی نہ تھی۔ اور اس کے بعد بھی مدتوں یہی حال رہا۔

علالت اور نازک حالت کی خبریں ہفتوں سے آ رہی تھیں اس لئے دل اس آخری خبر سننے کے لئے بھی تیار تھا لیکن اس تیاری سے بھی واقعہ کی اہمیت اور صدمہ کی شدت میں کوئی کمی نہیں ہو جاتی۔ فقیہ آج ہر وہ شخص سمجھا جاتا جسے عالمگیری شامی وغیرہ کے جزئیات حفظ ہوں مفتی صاحب مرحوم اس عامیانہ مفہوم میں نہیں بلکہ واقعۃً فقیہ تھے یعنی شریعت کے

منقول از صدق ۹ جنوری ۱۹۵۳ء

بڑے چھوٹے ہر مسئلہ میں تعمق سے کام لینے والے اور ان کی ذہانت ایسی تھی جیسے امام ابوحنیفہؒ کے ایک شاگرد رشید کی ہونا چاہیے باریک مسائل کی تہہ تک وہ بات کی بات میں پہنچ جاتے خلافت کمیٹی مرکزی کے جلسوں میں بار بار یہ نظارہ دیکھنے میں آیا کہ کسی مسئلہ میں شدید اختلاف ہے اور دونوں فریق ایک دوسرے کے خلاف بُری طرح الجھے ہوتے ہیں کہ مفتی صاحب نے ادھر توجہ فرمائی اور چند منٹ کے اندر ایسا آسان حل نکال دیا کہ جس پر فریقین بخوشی متحد ہوگئے اور اُن کے رسالہ تعلیم الاسلام کے نام سے گو بظاہر صرف مبتدیوں کے لئے ہیں لیکن درحقیقت منتہیوں سب کے کام کے ہیں ——— ایک بڑی بات یہ بھی کہ باوجود پختہ نیشلسٹ اور قوم پرور ہونے کے وہ اپنی اسلامیت اور اپنے عقائد میں بھی متشدد آخر تک رہے یہ نہ ہونے پایا کہ سیاست کی رَو میں بہ کر اپنے مقتضیات و مطالبات ایمانی میں کسی قسم کا ڈھیلا پن آجانے دیا ہو اور یہ وصف ایسا ہے کہ جو ان کے معاصرین میں کم ہی کسی میں پایا جاتا ہے جوش اور ہوش غیرت ایمانی اور فہم و فراست و تدبر کا اتنا خوشگوار امتزاج بھی نادر ہی کہیں دیکھنے میں آیا ہے تواضع و انکسار خوش خلقی مہمان نوازی وغیرہ کے اوصاف حسنہ اس پر مستزاد حالات سے بددل ہو کر ایک عرصہ سے گوشہ نشین ہوگئے تھے عمر ۷۵ اور ۸۰ کے درمیان تھی بہ حیثیت مجموعی اپنے کمالات کے لحاظ سے اپنی نظیر بس آپ تھے۔ اللہ انہیں بلند مراتب سے سرفراز فرمائے۔

محققؒ گیلانی[1]

○

جو کل تک ہر غمزدہ کے لئے مجسم تسکین و تشفی تھا آج خود اس کے غم میں کون اور کس کس کو تسلی دے؟ جو کل تک ہمہ تازگی و زندگی، ہمہ جوۓ دت و ذہانت تھا کس طرح یقین آئے کہ آج اس کا جسم خاکی زیر زمین پہونچ چکا ہے۔؟

فاضل گرامی حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی (آہ کہ ان کے نام کے ساتھ بجائے مد ظلہ العالی کے آج کس طرح مرحوم یا نور اللہ مرقدہٗ یا رحمۃ اللہ علیہ لکھا جائے۔ گو یا زبان و قلم کچھ روز بعد اسی کے عادی ہو جائیں گے) دورِ حاضر کے طبقۂ علما کے خواص میں نہیں — اخص الخواص میں تھے بلکہ کہنا چاہئے تھا کہ اپنی دقتِ نظر و نکتہ رسی کے لحاظ سے فرد فرید اور اپنی نظیر بس آپ ہی تھے۔ جامعہ عثمانیہ میں صدر شعبۂ دینیات و شیخ الحدیث سالہا سال رہے اور نظر جیسی حدیث پر تھی ویسی ہی قرآن مجید، فقہ، اصول فقہ، کلام تصوف اور معقولات پر بھی تھی عقائد اہل سنت میں پختگی دیوبندی تعلیم و تربیت کی کھلی ہوئی برکت تھی پھر جامعہ عثمانیہ میں بہ حیثیت استاد کے برسوں جو انگریزی خواں طلبہ اور اعلاڈ گریاں رکھنے والے استادوں سے یکجائی رہی اس نے علوم جدیدہ اور مسائل حاضرہ سے بھی انھیں پوری طرح باخبر کر دیا تھا۔ اور خیالات میں وسعت اور رواداری اسکی قدرتی نتیجہ تھی۔ خوش عقیدگی اور روشن خیالی، رسوخ فی الدین اور رواداری کی ایسی جامعیت کی

---

[1] (سنہ ۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲ء تا سنہ ۱۳۷۵ھ/۱۹۵۶ء)   صدق جدید سنہ ۱۹۵۶

یر کہیں اور شاید ہی مل سکے۔

مولانا بیک وقت مفسر، محدث، فقیہ، متکلم، معقولی اور صوفی صافی تھے۔ تاریخی مطالعہ
وسعت و کثرت نے انھیں مورخ بھی بنا دیا تھا۔ طلبہ اور اونچے یعنی درسی طلبہ کے حق میں بہترین
لم تھے اور ایک بہترین مقرر و خوش بیان خطیب بھی تھے۔ انبالہ کے ایک اجلاس ندوہ ۱۹۳۶ء
ں میں نے دیکھا کہ گو بولنے والے اور بھی اچھے اچھے علماء موجود تھے لیکن پبلک کی طرف سے
بار مطالبہ جس بزرگ کی تقریر کے لئے ہوتا وہ بعد مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کے بدیہی مولانا
نی تھے ـــ قوت تحریر کا جو ملکہ مولانا کو حاصل تھا اس سے ناظرین صدق نا آشنا نہیں۔
خاص طرز انشاء کے مالک تھے اور اس میں کسی کے مقلد نہیں خود اس کے موجد تھے۔ تحریر
سب سے بڑا وصف بے ساختگی و برجستگی تھی جب اور جس موضوع پر قلم اٹھایا بس لکھتے ہی
گئے۔ جو عنوان دوسروں کو پامال نظر آتے تھے ان میں بھی وہ نئے نئے نکتوں کے انبار لگاتے
چلے جاتے۔ خشکی ان کا قلم جانتا ہی نہ تھا تحریر کی سطر سطر جاندار ہوتی۔

مسلکاً دیوبندی ہونے کے باوجود بڑے بڑے ندویوں سے بڑھ کر روشن خیال تھے۔ اور
بدت و تجدد پسندیت سے بیزار و متنفر ہی نہیں بلکہ اس کے ' دمنشاء سے واقف تھے۔ اور ہر تازہ فتنہ کی گہری
بنیادوں پر پوری نظر رکھنے والے تھے۔ حمایت و نصرتِ اسلام میں ہزار با ہزار صفحہ لکھ ڈالے
ہی معاشیات، امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی، النبی الخاتم، تدوین قرآن، تدوین حدیث،
تدوین فقہ، ظہور نور، ابوذر غفاری، سوانح قاسمی وغیرہ کے علاوہ محض مضامین و مقالات ہی
ضخامت ہزار ہا صفحات تک پہونچے گی۔ کاش مولانا کے کوئی سعید شاگرد وقت نکال کر
متفرق و منتشر اجزا کو یکجا و مرتب کرنے کی   زحمت گوارا فرماتے! ـــ شاگردوں
کا ذکر آگیا تو یہ بھی کہہ رکھنے اور خوش ہونے کی بات ہے کہ مولانا نے ایک نہیں متعدد
افراد دل میں دینی و علمی ذوق کی روح پوری طرح پھونک گئے ہیں اور ان لوگوں نے
اہم دینی خدمات علمی رنگ میں کی ہیں ان کے اجر کے بھی بڑے حقدار خود مولانا ہی ہیں۔

بعض کتابوں کے ناتمام رہ جانے کا افسوس خصوصیت کے ساتھ ہے مثلاً تدوین حدیث جو تاریخ حدیث پر تھی. وہ اگر مکمل ہو جاتی تو منکرین حدیث کے شبہات کا بہترین مدلل و شافی جواب تھی مسند دارمی عنوانات بھی مولانا کے ذہن میں تھے سب کے سب اہم اور ضروری۔
حضرت آخر وقت تک طالب علم ہی رہے. آخری خطوط جو وفات سے چند ہی روز قبل موصول ہوئے علمی سوالات، علمی مسائل اور بعض اشکالات کے علمی جوابات سے بھرے ہوئے ہیں۔
مزاج میں انتہائی سادگی اور بے تکلفی تھی اپنی بڑائی اور اپنے کمالات کا شائبہ تک بھی وسوسہ بھی کہیں نہیں پیدا ہوا. اپنے سے چھوٹوں اور کمیں چھوٹوں کی بات کو اس التفات سے سنتے کہ وہ گویا ان کے ہمسر ہیں بلکہ بعض وقت تو اپنے چھوٹوں کو اتنا بڑھاتے کہ وہ بیچارے خود اپنے متعلق بڑی غلط فہمیوں میں مبتلا ہو جاتے ــــــــ بے تکلف و بے ساختہ طرز انشاء اور بے تصنع و پُرجوش رنگ تقریر دونوں اس سرشت و طبیعت کے پرتو تھے تحریر و تقریر دونوں میں بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک دریا اُبلا پڑ رہا ہے۔
طبیعت کے لحاظ سے اتنے وارستہ تھے کہ کھانے کو جو کچھ مل گیا بس اسی کو نعمت سمجھے۔ پہننے کو جو کچھ ملا خوش ہو کر پہن لیا. رہنے سہنے کا جو اونٹی سادہ معیار بھی وقت کے ساتھ نصیب ہو گیا اسی میں مگن زندگی گزار دی. ایک زمانہ میں موٹر بھی رکھا لیکن اُن کے لئے موٹر اور اکّہ اور چھکڑا اور پیدل سب برابر ہی تھے ــــــــ بڑے رقیق القلب بڑے رحم دل، بڑے نرم مزاج تھے. دوسرے سے اپنی بات منوانے کے فن سے واقف ہی نہ تھے. کسی ادنیٰ شخص کی بھی ناخوشی نہیں دیکھ سکتے تھے. اسے آزردہ دیکھ کر بلاوجہ اور خواہ مخواہ بھی اپنی غلطی تسلیم کرتے اور اسے منانے میں لگ جاتے۔

دوسروں کی امداد کا حوالہ دینے میں ذرا بھی بخیل اور تنگ نظر نہ تھے. ہر ادنیٰ امداد کا حوالہ بھی بڑی فیاضی اور خوش دلی سے دیتے اور اس کی تو میں شہادت آج اس دنیا میں بھی دیتا ہوں اور کل انشاء اللہ حشر میں بھی دوں گا کہ اپنی ۲۶۔۲۷ سال کے تعلق و ارتباط کی طویل مدت

ایک بار بھی اپنی بڑائی کا کوئی کلمہ ان کی زبان سے سننے میں نہ آیا — یہ صاف اوصاف
ولی نہیں غیر معمولی ہیں۔

تصوف کے بڑے جاننے والوں میں سے تھے۔ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی سے عقیدت
وصی بھی رکھتے تھے اور مناسبت طبعی و روحانی بھی، باوجود اس کے رسوم خانقاہی اور بدعا
ائی کے ذرا بھی قائل نہ تھے اور وہم پرستوں اور ضعیف الاعتقادیوں کے نزدیک بھی نہیں
تھے۔ اکبر کی زبان میں ؎

قائل میں تصوف کا ہوں اکبر لیکن
ارواح پرستی کو تصوف نہیں کہتے

ابطۂ بیعت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ سے تھی۔ اور طبیعت پر مذاق توحید
بر غالب تھا۔ نماز میں قرآن مجید اس خوش الحانی اور درد و دنا ڑسے پڑھتے کہ جی چاہتا گھنٹوں
سنتے رہیے۔

میرے ہم سن تھے اور حضرت تھانویؒ اور مولانا محمد علیؒ کی وفات کے بعد اب قلت کی زندہ
ہستیوں میں انھیں کی ذات میرے لئے محبوب ترین تھی ہم سن کی وفات میرے لئے بھی قریب
ت کی ایک اور گھنٹی بجا دی ہے اور محبوب کے سفر آخرت نے میرے لئے بھی اس منزل
مقصود میں ایک اور کشش و دلکشی پیدا کر دی ہے۔!

صحت ادھر عرصہ سے بہت گر گئی تھی پھر بھی اتنی جلدی وقت موعود آجانے کا ہم
غفلت کو خیال بھی نہ تھا شوق لقا رب پوری طرح رکھتے تھے جیسا کہ ایک درویش عارف
کو رکھنا چاہئے تھا اور جہاں تک دماغی قوت کے بس میں ہے خدا جانے کتنے اسرار غیب حل
کر چکے تھے۔ اصل حقائق کا انکشاف اب ہوا۔ اور اس وقت انشاء اللہ پوری طرح
ان لذتوں اور سرمدی راحتوں کی آغوش میں ہوں گے۔ ابھی چند ہی سال کی بات ہے
جب گیلانی مولانا سے ملنے جانا ہوا تھا اور ایک بار دفعۃً زور سا چکر سا آگیا تھا، اضطراراً

میں نے مولانا کا ہاتھ پکڑ لیا تھا اور دل نے آناً فاناً خوشی اس کی محسوس کی تھی کہ اب نماز جنازہ ہوگی ہی پڑھائیں گے مشیت کو یہ منظور نہ ہوا اور اب تو اس کی لگی ہوئی ہے کہ جس وقت اپ وقت موعود آئے گا (جو یقیناً اب دور نہیں) تو اپنے مالک مولا سے اپنے ایک قدیم تباہ کار رفیق و نیاز مند کی شفاعت میں اصرار و مبالغہ کرنے والوں میں ایک نمایاں و ممتاز شخصیت مولانا کی ہوگی۔ رخصت اے امام المسلمین عارضی طور پر رخصت انت انشاء اللہ لنا و لکم العافیۃ و انشاء اللہ بکم لاحقون۔

⁂ ——————— ⁂ ——————— ⁂

مضمون ختم ہو چکا تھا کہ مرحوم کے چھوٹے بھائی کا خط موصول ہوا کہ آج صبح بعد نماز بھائی صاحب بستر پر لیٹے ہی تھے اور میں بھی بغل کے پلنگ پر تھا کہ اچانک روح پرواز کر گئی ...... رات اس قدر خوش اور لشاش تھے کہ میں نے زندگی بھر اتنا خوش نہیں دیکھا تھا خوب خوب گایا اور گویا رقص کیا جب ہی میرا ماتھا ٹھنکا تھا کہ بعد نماز فجر یہ حادثہ پیش آگیا جو دوسروں کو جنت و رحمت کی بشارتیں سناتا رہتا اور مقبول شخصے مغفرت کے پروانے تقسیم کرتا رہتا تھا۔ دنیا نے دیکھ لیا کہ خود اس کا انجام کتنا طرب آمیز ہوا! ناسوت کی آخری رات اس کے لئے "شب برات" تھی وعدہ وصال کے قرب نے اسے رات بھر بیخود رکھا اور نماز فجر کے بعد بلاوا آیا تو پاس ہی لیٹے ہوئے بھائی کو "سکرات" کا پتہ چلنے نہ پایا! والناشطات نشطاً کے وعدہ کا تحقق اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا!

———

مولانا صدر یار جنگؒ

نام نامی پر نظر سب سے پہلے اُس وقت پڑی جب اپنا زمانہ اسکولی طالب علمی کا
تھا اور مولنا شیروانی ایک نامور سختہ کار اہل قلم اپنی جوانی کی آخری منزلوں میں تھے اور علیگڈھ
منتھلی کے مضمون نگار رہتے یہ ذکر کوئی ۱۹۰۵ء کا ہے چند ہی روز میں دیکھا کہ اسم گرامی الندوہ (لکھنؤ)
کے سرورق پر شریک ادارت کی حیثیت سے ہر مہینہ چھپ رہا ہے۔ ایک ایڈیٹر تو مولانا
شبلی نعمانی تھے اور دوسرے ان کے حبیب اور ہم تا ذیر مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی الندوہ
میں شیروانی صاحب نے لکھا یا تو برائے نام ہی لیکن بہ حیثیت ایڈیٹر کے نام برسوں چھپتا رہا (کچھ ہم رنگی
اس باب میں مولانا مزید مرحوم) سے مل رہی کہ تخلص ان کا بچہ بچہ کی زبان پر لیکن شاعری
نمونہ دیکھنا چاہیے تو کسی ریسرچ اسکالر کی دستگیری کے بغیر کامیابی ممکن نہیں۔ مضمون شائع
چند سال کی مدت ادارت میں ایک ہی لکھا حیات خسرو دو نمبروں میں باقی ان کے نام کا تلازم
مولانا شبلی کے نام کے ساتھ ذہن میں خوب جم گیا! ـــــــ دو چار سال اور گذرے
اب کالج کی طالب علمی کے زمانہ میں جب تقریباً روزانہ حاضری مولانا شبلی کی خدمت میں
ہونے لگی، تو معلوم ہوا کہ کم از کم جہاں تک معاملات ندوہ کا تعلق ہے۔ خاں شیروانی اور
شیخ نعمانی کے درمیان چولی دامن کا سا تعلق ہے، ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم۔ علی گڈھ

منقول از صدق جدید ۲۹ دسمبر ۱۹۷۳ء

اور اعظم گڑھ کے درمیان ایک اور وجہ ارتباط ایک اور رشتہ توافق واتحاد!

زیارت سب سے پہلے ندوہ کے جلسۂ نظامیہ میں ہوئی سنہ غالباً ۱۹۱۱ء تھا

ارکان میں دو پارٹیاں تھیں (اور مسلمانوں کی کس انجمن یا ادارہ میں پارٹیاں نہیں، ایک کے لیڈر مولانا شبلی تھے اور دوسرے کے قاری شاہ سلیمان پھلواری اور مولانا خلیل الرحمٰن پوری، ہم لوگ کالج کے چند لڑکے بھی تماشائیوں میں شریک کہ اگر کسی موقع پر پبلک مدد کی ضرورت پڑی پبلک کے نمائندہ بن کر مولانا شبلی کو کمک پہونچائی جائے گی۔ فلاں آئے اور فلاں صاحب آئے۔ اپنے لئے فخر کا یہ موقع کیا کم تھا کہ ایسے معزز جلسے میں کو مل گیا۔ تماشائی ہی کی حیثیت سے سہی! ـــ یہاں تک کہ مولانا شیروانی آگئے کا نمونہ، چہرہ پر شرافت برستی ہوئی، متانت بلائیں لیتی ہوئی، مشہور یہ تھا کہ یہ زبردست "شبلوی" ہیں، دیکھنے میں یہ آیا کہ یہ اپنا دامن حریفانہ آلودگی سے بچائے ہوئے میں گرمی، نہ لہجہ میں درشتی، ایک پیکر حلم وآشتی سنہ غالباً ۱۹۱۵ء تھا کہ ابھی ایک لغو سی لغو تواب کہہ رہا ہوں اس وقت تو وجہ نازش تھی، فلسفۂ اجتماع کا مقدمہ الناظر میں اس میں دہلی کے ایک واقعہ سے متعلق مولانا شبلی پر تعریض تھی اس کی تردید اور صفائی میں شاید عینی کے شیروانی صاحب کا مضمون الناظر کے دوسرے ہی نمبر میں موجود لیکن تردید نہ تلخی اور نہ تعریض بس صاف اور سادہ بیان واقعہ سیرت کی شرافت کا اثر چہرہ پر نمایاں نہ قلم بھی اسی رنگ میں ڈوبا ہوا تھا۔

۱۹۱۸ء کی شاید جولائی کا مہینہ تھا کہ شیروانی صاحب حیدرآباد صدر الصدور مذہبی ہو کر نئے نئے پہنچے۔ ان کی مذہبیت اور گہری دینداری کا ڈنکا بجا ہوا۔ ادھر اپنی کے اس دور میں الحاد و بے دینی کے لئے بجا طور پر رسوا و بدنام اور میں اسی زمانہ میری کتاب کے سلسلہ میں خاص طور پر حیدرآباد مسلم پریس کی زد میں آیا ہوا، شیروانی عہدہ کے لحاظ سے بھی مجھ سے کہیں اونچے مرتبہ پر، پہلی بار حاضری کی نوبت

حالات میں ڈوب گیا تو ڈرتے ڈرتے لیکن پہلی ہی ملاقات میں معلوم ہوگیا کہ ڈر بالکل
بے جا تھا خوب ملے اور اس کا سایہ ہی نہیں پڑنے دیا کہ میری بدمذہبی اور بدعقیدگی
شفقتوں اور عنایتوں کی راہ میں حائل ہو رہی ہے! اپنا رہنا اس کے بعد کچھ ہی
حیدرآباد میں رہا۔ شیروانی صاحب کی فرض شناسی دیانت، بے لوث مستعدی
کارگزاری کے چرچے سن سن کر جی خوش ہوتا رہا۔

اگست میں رخصت پر لکھنؤ آیا اور یہاں سے استعفا لکھ کر بھیجا۔ بےکاری کو ابھی آٹھ
مہینے ہوئے تھے کہ اپریل یا مئی میں سر امین جنگ مرحوم (صدرالمہام پیش گاہ مبارک) کا تار
اعلیٰحضرت نے یاد فرمایا ہے، فوراً آجاؤ، گیا۔ اسٹیشن پر ہی حکم نامہ ملا کہ قیام سرکاری طور
صدر امور مذہبی کے یہاں رہیگا، جانا اور رہنا پڑا۔ ۴-۵ روز کے قیام میں مولانا کو
سے دیکھنے کا موقع ملا۔ وہ اُنکی صحیح مذہبیت (جس میں تعصب اور نفرت کا شائبہ
بھی نہیں) پختگی (جو کرختگی سے ناآشنا تھی) معتدل و متوازن خوش اخلاقی، مہمان نوازی، ایک
اوقات کی پابندی، جدید اور قدیم رنگ کی خوشگوار آمیزش، لباس و طرز معاشرت
وضعداری، ایک ایک چیز کا مشاہدہ ہوگیا۔ اور ایک ایک چیز دل میں اُتر گئی۔

اعلیٰحضرت کے یہاں باریابی اور میرے لئے ماہوار تصنیفی وظیفہ کی منظوری کے سارے
مرحلے مرحوم جس شفقت اور اخلاص کے ساتھ قدم قدم پر رہنمائی فرماتے رہے اس
کا نقش آج تک دل پر تازہ ہے۔ اب تعلقات بڑھے اور مراسلت خاصی کثرت سے رہنے
لگی۔ ذاتی قومی ملی دینی سب ہی مسئلے موضوع گفتگو رہے اور ملاقاتیں کبھی لکھنؤ میں
اور کبھی علی گڑھ میں اور کبھی حیدرآباد میں ہی، مرحوم کو ندوہ کے ساتھ شغف اس
کے معنی رکن اعلیٰ تھے۔ پابندی کے ساتھ اس کے ہر جلسہ میں شریک ہوتے ــ
سے سفر کر کے لکھنؤ آتے اور ہمیشہ اپنے محب خصوصی منشی احتشام علی علوی کاکوروی
کے یہاں ان کی خیالی گنج والی کوٹھی میں ٹھہرتے جب تک سفر کی قوت ذرا بھی باقی رہی

اس معمول میں فرق نہ آنے پایا اور علی گڑھ تو گویا ان کا گھر ہی تھا یونیورسٹی کی رٹ کی ہر میٹنگ
التزام کے ساتھ کیوں نہ آتے !

مسلم یونی ورسٹی میں وائس چانسلر طوعاً دکرہاً ہر تھوڑی مدت کے بعد بدلتے رہے ہیں
ابھی مہاراجہ محمود آباد اس عہدہ پر ہیں، تو ابھی صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کی کل سرسلیمان کا
تخت اُتر رہا ہے تو آج سر راس مسعود کے ورود مسعود کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ ابھی نواب
مزمل اللہ خاں کا طوطی بول رہا ہے تو ابھی سر ضیاء الدین کا ستارۂ اقبال عروج پر ہے۔ ابھی
نواب اسمٰعیل خاں ہاتھوں ہاتھ لائے جا رہے ہیں تو ابھی ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کی پیشوائی کے لئے
فرش بچھ رہے ہیں، کورٹ کے ممبر کچھ ان کے ساتھ اور کچھ ان اور کچھ ان
دونوں سے الگ صرف اپنے ساتھ شیروانی کا مرکز ثقل ہر حال میں اپنی جگہ پر قائم، ندوہ
میں تو اپنا امتیاز اسی طرح رکھے ہوئے تھے۔ مولانا شبلی اور منشی احتشام علی کی باہم
آپس میں بر سرِ پیکار لیکن شیروانی صاحب کے تعلقات دونوں سے یکساں ہموار و خوشگوار گویا
دونوں کے درمیان ایک نقطۂ اتصال !

سنہ ۱۹۲۰ء کا زمانہ اسلامی ہند کی تاریخ میں ایک ہیجان کا دور ہوا ہے۔ تحریک خلافت و
ترک موالات کا طوفان زوروں پر ملک کا سوادِ اعظم شیخ الہند اور مولانا عبدالباری
فرنگی محلی اور علی برادران اور مولانا ابو الکلام کے ساتھ ساری فضا پر یہی حضرات چھائے
ہوئے ندوہ اور علی گڑھ دونوں پر اور ندوہ غریب تو خیر اصلی اور معرکہ در جب
علی گڑھ تھا۔ شیروانی صاحب مع اپنے گنے چنے افراد کے دوسرے کیمپ میں کچھ نہ پوچھئے
کہ کیا کچھ سننا پڑا کیا کچھ سہنا پڑا جوش اور ہیجان کے وقت کسی کو اپنی زبان پر قابو
رہا ہے۔ آج گورنمنٹ کے جاسوس کہلائے۔ اور کل حبیب الرحمن سے حبیب الشیطان
مشہور ہوئے ! ـــــ یہ بندۂ خدا سب کچھ صبر و متانت سے سنتا رہا ـــــ ایک زمانہ
وہ تھا ۱۳۔ ۱۴ سال قبل جب ابو الکلام آزاد کا شمار حلقہ میں تبدیلی کے تھا

اور مولانا شیروانی کے ہاں اُن کا تقرب خود اُن کے لئے باعث فخر و مباہات تھا۔ اب دیکھتے دیکھتے وقت آ گیا تھا کہ مولانا ابوالکلام لیڈری کے بلند بام پر تھے اور شیروانی صاحب ایک اہل قلم اور چھوٹے موٹے رئیس کی حیثیت سے جہاں تھے وہیں قائم — ظرف اور شرافت کے امتحان کے لئے دوستی و اتحاد کا نہیں مخالفت و بیزاری ہی کا وقت ہوتا ہے، پٹھان اپنی تند مزاجی کے لئے بدنام ہیں اور شیروانی پٹھانوں ہی کے ایک خاندان کا نام ہے۔ صدر یار جنگ کی مثال نے دکھا دیا کہ جنھوں نے پٹھانوں کو حلم و متانت سے یکسر معریٰ قرار دیا ہے، انھوں نے کلیہ قائم کرنے میں جلدی یا غلطی کی ہے، محمد علی جوہر کا ایک شعر خفیف تصرف کے ساتھ ؎

ظلم ہے کہ سب کو کر دا ایک سا خیال
پاتے ہی حلم[1] بھی کبھی شیروانیوں میں ہم

مارچ ۱۹۲۲ء تھا کہ اس وقت کی خوش عقیدگی کے جوش میں ارادہ عرس اجمیر میں شرکت کا کر لیا۔ لکھنؤ سے ساتھ مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے قافلہ کا ہو گیا، ان پر باوجود علم و فضل کے مشائخانہ رنگ غالب تھا، اجمیر پہونچ کر مولانا کی پارٹی کی خوب خاطرداریاں ہوگئیں، شیروانی صاحب بھی یہاں آئے ہوئے تھے۔ ذاتی طور پر یہ آستانہ چشت کے عقیدتمند تو تھے ہی لیکن یہاں اس وقت ان کی آمد سرکاری حیثیت سے تھی۔ مملکت حیدرآباد کے صدر الصدور محکمہ امور مذہبی کی حیثیت سے آئے ہوئے تھے، اعزاز و تکریم کے ساتھ ہر طرف ہاتھوں ہاتھ لئے جا رہے تھے اور دیوان صاحب درگاہ کے مہمان خاص تھے۔ رات کے وقت محفل سماع میں دیکھا، عام لوگوں کی صف میں مسند سے دور ایک معمولی شریک محفل کی حیثیت سے بیٹھے ہوئے اُن سے بہتر جگہ پر تو ہم لوگ قابض تھے، وہ ذرا چاہتے تو بہتر

---

[1] اس شعر میں بجائے حلم کے عقل تھا۔

سے بہتر جگہ ان کے لئے خان کرائی جاسکتی تھی لیکن طبیعت میں انکسار کہ ہر طرح قدرت رکھنے کے باوجود اپنے لئے مقام امتیاز کسی طرح گوار نہیں غلبہ تواضع کا مشاہدہ کا یہی ایک موقع نہ تھا حیدرآباد، اعظم گڑھ، علی گڑھ، لکھنؤ، میں خدا معلوم کتنی بار اور مشاہدے اسی قسم کے پہلے بھی ہو چکے تھے۔ اور بعد کو بھی ہوتے رہے۔ سنہ ۱۹۴۲ء یا سنہ ۱۹۴۳ء میں علی گڑھ میں کسی عالم دین کا تقرر ہونے والا تھا۔ انتخابی کمیٹی میں مولانا شیروانی کے ساتھ یہ خاکسار بھی تھا۔ انٹرویو کے وقت جب مہمان علماء آنے شروع ہو گئے تو صدر مجلس (وائس چانسلر ڈاکٹر ضیاء الدین احمد) کرسی صدارت پر صدر یار جنگ کو بٹھا کسی ضرورت سے باہر چلے گئے، ان حضرت نے کیا کیا معاً خود بھی کرسی صدارت چھوڑ کر اپنی جگہ اس بے علم و عمل کو بٹھا دیا۔ میں شرمندگی سے گڑا جا رہا تھا۔ لیکن ان کے شدید اصرار کے سامنے میرا انکار کیا کچھ چل پاتا! — اور آخر زمانہ میں جب تک ذرا بھی سفر کے قابل رہے تو بار بار دیکھنے میں آیا کہ لکھنؤ میں ندوہ کی مجلس انتظامیہ کا جلسہ ہو رہا ہے اور حضرت صدر یار جنگ اپنی مسند صدارت چھوڑے ہوئے اپنے ایک نیاز مند ہی کی عزت افزائی کر رہے ہیں!

گفتگو بڑی پر لطف ہوتی اور پر مغز بھی علمی، ادبی، شعری، مذہبی، سیاسی، تعلیمی جو موضوع بھی چاہئے چھیڑ دیکھئے، اور گھنٹوں اس مجلس سے سیری نہ ہو گی۔ اللہ نے رئیس ہونے کے ساتھ ساتھ دل کا رئیس بھی بنا یا تھا۔ کھاتے پیتے تو خوب تھے ہی کھلانے کا ذوق بھی خوب رکھتے تھے۔ اور جاڑوں کے موسم میں شب دیگ کی دعوت بڑے اہتمام سے کرتے تھے۔ اس دعوت میں جو ایک بار شریک ہو جاتا اس کو مزہ مدتوں نہ بھولتا۔ تحریر میں ادیب سے بڑھ کر انشا پرداز کی شان رکھتے تھے۔ سلجھا ہوا انداز بیان اور بہر طرح گٹھا ہوا، الفاظ ضرورت سے زیادہ نہ کم بس ٹھیک اتنے ہی جتنے ادائے مطلب کے لئے ضروری ہوتے گویا ہوشیار اور فن کار معمار میں گڑھی ہوئی اینٹیں چنیں

چمن کراور گن گن کر گا رہا ہے ــــــ اور تحریر سے بڑھ کر اس کمال فن کا ظہور تقریر و گفتگو دونوں میں، میدان میں خطاب عام ہو تو اور کمرے کے اندر خطاب خاص ہو تو زبان حشو و زوائد سے ناآشنا، میٹھے میٹھے بول گنے چنے و بکشش و تاثرات کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ۱۹۲۶ء میں جب حج و زیارت سے واپس آئے ہیں تو حالات سفر خصوصاً مشاہدات مدینہ منورہ سادہ اور بے ساختہ اس انداز میں بیان کرتے کہ سماں بندھ جاتا، خود بھی آب دیدہ ہو جاتے اور سننے والوں کو بھی رلا دیتے غیرت دینی اور حرارت ایمانی کے لوکہنا چاہئے کہ پتلے ہی تھے ۱۹۳۰ء میں اردو کے ایک مشہور رسالہ نے دینی و اعتقادی حیثیت سے بڑا سر اٹھا رکھا تھا ضرورت اس کی تھی کہ ملت اپنی اجتماعی قوت سے فتنہ کی سرکوبی کرے خیر وہ تو جوں توں کر کے ہو گیا، شروع ۱۹۳۳ء میں ایک منزل ایسی آئی کہ قانونی کارروائی کے لئے حکومت وقت کی منظوری لینی ضروری تھی صوبہ گورنمنٹ کے ہوم ممبر نواب مزمل اللہ خاں مرحوم تھے ان پر مجرم کی طرف سے سفارشوں کا جادو چل چکا تھا۔ ان اثرات کو باطل کرنے کے لئے درکار ایسی ہی زبردست شخصیت تھی اور وہ صدر یار جنگ کی ذات میں ہاتھ گئی ــــــ بیچارے نے پس پردہ رہ کر وہ سب کچھ کر دیا جو ایک مرد مومن کو ان حالات میں کرنا تھا۔ ابے چند سال گذرے تھے کہ ایک اور فتنہ کا سامنا کرنا پڑا۔ آج سے ۵۴ سال قبل ہمارے جوار میں ایک نوجوان وکیل سجاد علی انصاری مرحوم تھے پڑھنے لکھنے کے بڑے شائق بڑے ذہین اور شوخ نگار ذاتی طور پر خدا کے فضل سے پورے مذہبی لیکن مذہبی عنوانات پر قلم اٹھاتے تو معلومات کی سطحیت و بے مغزی کے ساتھ شوخیوں میں بھی حدود سے تجاوز کر جاتے علی گڑھ میگزین وغیرہ میں طالب علمی کے زمانہ میں مضمون لکھا کرتے اور ہم لوگ بھی داد دیتے جس طرح ہر نومشق اور ہونہار اہل قلم کو اس کی ہمت افزائی کے خیال سے داد دی جاتی ہے اللہ کا کرنا کہ ۲۲ء میں تو سجاد مرحوم کا بھی عین شباب میں انتقال ہو گیا

اور اس کے کئی سال بعد بعض خوش مذاق بے فکروں نے ان کے مضامین اور ایک نا تمام ڈرامہ کو کتابی صورت میں چھاپ دیا۔ اور علی گڑھ کے شعبۂ اردو کے کارکنوں کو خدا معلوم اس میں کون سی ادبی خوبیاں نظر آئیں کہ کتاب کو داخل نصاب کر دیا۔ اس خاکسار کو جب اس کا علم ہوا تو اس کھلی ہوئی بد مذاقی پر حیرت کے ساتھ غصہ بھی آیا اور پہلے باادب تمام یونیورسٹی کے استادوں کی خدمت میں عرض معروض کیا مطلق پذیرائی نہ ہوئی۔ [illegible] اور مجبور ہو کر چیخنا چلانا پڑا۔ اور اب یہاں سے شرکت صدر یار جنگ مرحوم کی شروع ہوتی ہے۔ وسط ۱۹۴۳ء میں ایک تحقیقاتی کمیٹی قائم ہوئی جس کے صدر موصوف تھے۔ اس مجلس نے متفقہ طور پر کتاب کو نصاب سے نکلوا دیا۔ حضرت کی پوری رائے صدق ۸ نومبر ۴۳ء میں اس کے ڈھائی تین کالموں میں درج ہو چکی ہے۔ یہاں اس کے چند اقتباسات کافی ہوں گے۔

"علی گڑھ میگزین کی جو بھی عزت کی جائے، بہرحال اردو کے اعلیٰ میگزین میں نہ تھا۔ اس میں مضامین کی اشاعت کسی بلندی خیال یا پاکیزگی ادب کی ضامن نہیں ہو سکتی"

سخت قابلِ افسوس اور خطرناک یہ پہلو ہے کہ سجاد فلسفہ اخلاق مذہب سب سے بیزار ہیں، مذہبی ادب کا ایک فقرہ میں بہ خیال خود خاتمہ کر دیا ہے گویا ان کے یہاں کوئی اصول زندگی نہیں، بے اصول زندگی کے محبوب و مقبول ہے۔ اُن کے ہاں تین محبوب ہیں، عورت کا شباب بشرطیکہ وہ عفت و عصمت کی گندگی سے پاک و صاف ہو غرق شباب تجربہ جو کسی کرے پر داد عیش دے رہی ہو وفاداری پابندی سے سخت بیزار ہو، کمالات نسوانی کا بہترین نمونہ ہے، اس کی تعریف میں ان کے تمام مضامین رطب اللسان اور گل ریز ہیں اگر کوئی نوجوان عورت نکاح کر کے عصمت و عفت کی زندگی بسر کرے تو وہ

۹۔ خارج از بحث ننگ انسانیت ہے۔

دوسرا محبوب معصیت لطیف ہے مگر باوجود پوری کاوش کے ہم کو پتہ نہ لگا کہ ان دو لفظوں کا اصلی مفہوم مضمون نگار کے یہاں کیا ہے پڑھنے والا کسی گناہ سے لطف لینا چاہے اس کو محبوب قـــرار دے لے۔

تیسرا محبوب ان کا شیطان اور شیطنیت ہے۔ اوّل سے آخر تک شیطنیت کو سراہا ہے خلاصۂ کائنات قرار دیا ہے بلکہ پیدائش عالم کی اصل حکمت۔ اس کے مقابلہ میں انبیاء کرام ملائکہ مقربین بلکہ ان کے ڈرامہ "روز جزا" کا خدا بھی پست و بے وقعت ہے حضرت جبریل اور دوسرے مقرب فرشتوں کی بھی جس طرح اس ڈرامہ میں شیطان کے مقابلہ میں تضحیک کی گئی ہے، اسکو پڑھ کر ڈرامہ نگار کی فہم و دانش پر سخت تاسف ہوتا ہے۔ مذہب کے استخفاف سے مختصر خیال اوّل سے آخر تک بھرا ہوا ہے مضامین زلیخا اور روز جزا میں جس طرح مضامین قرآنی کے مقابلہ میں کم فہمی جسارت اور خیرہ چشمی کا ارتکاب ہے وہ قابل صد لعنت ہے ...... بہر حال میری رائے میں مختصر خیال نہ ادبیت نہ لٹریچر کی کوئی اعلیٰ خوبی اور رنگینی اور نصب العین کی اس طرح یہ کتاب مسلم یونیورسٹی کے اعلیٰ درس میں رہنے کا اپنی کسی خوبی کے لحاظ سے حق نہیں رکھتی ہے اس کے اوصاف خود اس کے قدردانوں نے دو تین لفظوں میں بیان فرمائے ہیں "شعلہ مستعجلہ کے مانند گل اور خاموش چہر تاریکی اور اندھیرا۔"

اقتباس کے ذرا لمبے ہو گئے سے مرحوم کی ادبیت ذوق نظر مذہبیت سب پر خاص روشنی پڑ گئی مسلم یونیورسٹی کی دینیت کے حق میں وہ ایک ستون مستحکم تھے! اور مدت سے ان کی تحریریں اردو میں ادب صالح کا ایک کامل ترین نمونہ تھیں۔ اب ایک

جامع شخصیت: ڈھونڈ ھنے سے بھی کہاں نظر آئے گی؟ ——— کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ
سیکڑوں بار کی طرح ایک بار پھر پڑھ کر دل تمام کیجئے۔

ایک بزرگ کا وصال

○

اخباری شہرت کے آدمی نہ تھے لیکن مرجع خلائق ضرور تھے۔ وطن شہر لکھنؤ سے متصل مقام بجنور تھا، لیکن فیض کا حلقہ بہت دور تک پھیلا ہوا تھا۔ لکھنؤ، اناؤ، کان پور، بارہ بنکی، فیض آباد، جون پور، الہ آباد، رائے بریلی، سیتا پور اور ان شہروں کے قصبات اور دیہات کا ذکر نہیں دور دراز مقامات بھوپال، سہارن پور، جھانسی، ناگپور، جبل پور، بمبئی، پونا، ڈھاکہ، چاٹگام تک سے لوگ کھنچے ہوئے چلے آتے ہیں اور حضرت خود جہاں کہیں پہنچ جاتے ہیں، ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے، خلقت معلوم ہوتا تھا کہ ٹوٹی پڑتی ہے۔

۸؍ ذی الحجہ ۱۱؍ ستمبر ۱۹۵۱ء کو عین موسم حج میں عین سرزمین مکہ پر انھیں بافیض و بے مثال بزرگ نے جنھیں دنیا میں مولوی حاجی محمد شفیع بجنوری کے نام سے یاد کرتی تھی داعی اجل کو لبیک کہا۔

یہ تاریخ اور یہ زمین اگر نہ ملتی تو حیرت ہوتی اس سرزمین کے بار بار چکر اتنے بار لگائے تھے کہ حجاز گویا وطن ہی بن چکا تھا۔ حج و زیارت کی سعادت کم از کم ۲۵ بار تو ضرور ہی حاصل ہو چکی تھی۔ عجب نہیں کہ اس سے زائد ہی مرتبہ عمر اگر اسی سال سے اوپر تقریباً ۸۵ ہی سال کی تھی، لیکن ہڈی چوڑی سینہ کشادہ جسم ایسا ابھرا کہ اصل سن سے ۱۵-۲۰ سال سے کم ہی معلوم ہوتے تھے۔

صدق جدید ۲۶؍ اکتوبر ۱۹۵۱ء — ۱۲؍ اکتوبر ۱۹۵۱ء

پُرانے دیکھنے والوں اور بوڑھے رفیقوں کا بیان ہے کہ جذب و استغراق کی کیفیتیں پیدا ہوئیں
کشف تکوینی اس غضب کا تھا کہ مستقبل کے واقعات کثرت سے اور بے اختیار زبان پر آجاتے
عجب عجب قصے لوگوں کی زبان پر اس دورِ نوعمری کے تھے بعض تو بالکل ناقابلِ یقین حد تک
رت انگیز اذکار و اشغال ریاضتیں مجاہدے، کرامتیں ایک سے بڑھ کر ایک عجیب اسی زمانہ
تعلق منقول ہیں۔

صوفیہ و مشائخ کے درمیان ایک شغل شغلِ سدی کے نام سے موسوم ہے اس میں کہا
تا ہے کہ سالک کے جسم کا ایک ایک عضو اس سے الگ ہو جاتا ہے ابھی چند سال ہوئے
ثقہ صاحبِ علم نے ایک واسطے سے یا شاید دو واسطے ہوں، یہ روایت بیان کی کہ راوی
نے محض اتفاق سے ایک بار حاجی صاحب کو عین اسی حالت میں دیکھ لیا تھا۔ ضرور نہیں کہ
قسم کے روائتیں صحیح بھی ہوں تاہم کسی ذات سے متعلق ان کی کثرتِ اشاعت بالکل
معنی بھی تو نہیں کہی جا سکتی۔

تعلیم باطن و تربیت سلوک کے لئے مرشد بھی ایسا ہاتھ آگیا۔ جو اپنے وقت میں امام
ی تھا قصبہ گنج مرادآباد (ضلع اناؤ) میں محدث مولانا فضل رحمٰن نقشبندی ایک بڑے پایہ
بزرگ تھے اتباعِ سنّت کے پیکرِ بے مثال بیعت انھیں سے کی محض بیعتِ اعتقادی
یں بیعتِ عشق بھی۔ جوہر خود اتنا قابل اور مربی ایسا کامل زیارت کعبۃ اللہ کا شوق
جنون تھا ہی۔ ایک روز کیفیات سے لبریز جوان مرید نے مرشد سے بے تابانہ عرض کیا کہ حضر
زت دیں اب کی قصدِ حج و زیارتِ حرم رکھتا ہوں' ارشاد ہوا زادِ راہ کا بھی سامان ہے؟
ب میں مستانہ بیخودی کے ساتھ یہ شعر زبان سے نکلا ؎

در رہِ منزلِ لیلیٰ کہ خطرہاست بسے
شرطِ اول قدم آنست کہ مجنوں باشی

مولانا باوجود اس کے کہ عارفِ کامل اور صاحبِ مقام تھے مغلوب الحال عاشق

صادق کے جذبات سے چند سکنڈ کے لئے خود بیخود ہو گئے اور بے اختیار چیخ زبان سے نکل گئی لیکن فوراً سنبھلے اور ارشاد فرمایا کہ کیا واہیات ہے میں مسئلہ شرعی دریافت کر رہا ہوں اور تم جواب میں شاعری کر رہے ہو۔

بات ہو گئی درمیانی مرحلے چھوڑیئے عین حج کے موسم میں جب خانہ کعبہ کا دروازہ کھلا ہوتا ہے اور ہر حاجی وزائر قدرۃً شوق دیدکا رکھتا ہے شیخ کلید بردار کی نظر پڑی کہ ایک حاجی بار بار بیتابانہ طواف تو کر رہا ہے مگر معلوم ہو رہا ہے کہ داخلی کا نہایت درجہ آرزومند ہے لیکن اس کا قصد نہیں کرتا ہے۔ داخلی کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ بلا کسی قید کے اور بلا کسی مطالبہ و نذرانہ کے ہونا چاہیے لیکن کلید بردار خاندان نے صدیوں سے اپنا دستور یہ بنا رکھا ہے کہ بلا نذرانہ وصول کئے ہوئے کسی کو اندر جانے نہیں دیتے فقہا نے اسے رشوت کے حکم میں رکھا ہے اور اسے ناجائز بتایا ہے۔ عاشق دنیا عالم میں اب کشمکش ہو رہی ہے۔ یہ عاشق صادق صاحب علم بھی تھا۔ اور مست ہونے کے ساتھ بیدار بھی۔ کچھ دیر کے بعد عشق علم پر غالب آگیا اور یہ نوجوان نذرانہ کا روپیہ بہ کراہیت دربان کی طرف پھینکتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ لیکن ادھر اس کا جانا تھا کہ ادھر وہ صاحب اختلاج قلب میں مبتلا ہو گئے اور بے اختیار یہ چاہنے لگے کہ وہ مرد خدا ابھی واپس ہو تو ابھی یہ جبری نذر اس کی خدمت میں معذرت کے ساتھ واپس کر دی جائے۔ خدا خدا کر کے وہ وقت آیا اور جب وہ نوجوان باہر نکلنے لگا تو شیخ صاحب نے خود معتقد ہو کر وہ نذر اسے واپس کی اور معاً ان کی طبیعت بحال ہو گئی۔ بتانے کی ضرورت نہیں کہ وہ سوختہ قلب ہمارے ہی حاجی محمد شفیع بجنوری تھے

مولانا تھانوی جن کے کمالات روحانی وعرفانی کا آفتاب بعد میں چمکا اس وقت محض ایک نوعمر مولوی ہی تھے۔ کان پور کے مدرسہ جامع العلوم کے صدر اور شہرت صرف ایک اچھے مدرس کی حیثیت سے رکھتے تھے۔ حضرت گنج مرادآبادی کی خدمت میں اکتساب فیض کے لئے حاضر ہوئے واپسی کے وقت حضرت نے اپنے اسی عزیز مرید کو ان کے سپرد فرمایا

تحسینی الفاظ اس طرح کے فرمائے کہ ہمارے اس لڑکے کو پوری طرح پڑھا دینا اور کمال، مولانا ہی اپنے ہر طالب علم کے حق میں سراپا شفقت و توجہ تھے، چہ جائیکہ اتنے زبردست وسیلہ سفارش کے بعد حاجی صاحب نے علوم شرعی ظاہری کی تحصیل و تکمیل کئی سال تک اسی مدرسہ میں رہ کر کی۔ استاد کامل کی رہبری و نگرانی میں اور پورے عالم بن کر نکلے تحصیل معاش کے بعد فن طب کی تعلیم حاصل کری غالباً اس زمانہ میں میرٹھ کے نامور طبیب حکیم محمد مصطفےٰ صاحب بجنوری مرحوم بھی حاجی صاحب کے ہم درس اسی مدرسہ میں تھے۔

حاجی صاحب کے قصے کشف و کرامت کے اس دور کے عام ہیں۔ ایک ثقہ راوی نے اپنا شاہدہ مجھ سے ۱۵، ۲۰ سال ہوئے بیان کیا تھا کہ ایک رات کو مطالعہ کے وقت حاجی صاحب حجرہ میں آگ لگ گئی شعلے بلند ہونے لگے بلکہ کپڑوں تک میں آگ پہونچ گئی لیکن حاجی صاحب بالکل محفوظ رہے بلکہ اسی طرح مطالعہ میں مشغول! ایسے عجائب و خوارق کی توجیہ و تاویل جو بھی جا سکے۔ بہر حال جس طرح انھیں آنکھ بند کر کے قبول کر لینا آسان نہیں۔ اسی طرح انکی یکسر تردید بھی ثقہ و معتبر گواہوں کے ہوتے ہوئے ذرا مشکل ہی ہے۔ اور خیر یہ عقیدہ تو سب نے فالفور اس وقت عام ہو گیا تھا کہ حاجی صاحب مستجاب الدعوات ہیں، ان کی زبان جو کچھ نکل جاتا ہے وہی ہو کر رہتا ہے ـــــ ایک واقعہ اس سلسلہ میں بڑا اہم اور خیر ہے جسے خود حضرت تھانویؒ کا بیان کیا ہوا:ـ

مدرسہ میں تعطیل تھی باہر سے ایک رفیق درس کا خط حاجی صاحب کے نام آیا پتہ پر بانی تعظیمی القاب "قطب وقت" وغیرہ درج تھے۔ مدرسہ کی ڈاک صدر مدرس کی حیثیت مولانا تھانوی کے پاس آتی تھی۔ حضرت نے حاجی صاحب کو بلا کر طنز سے ارشاد فرمایا کہ لیجئے تو آپ قطب وقت ہو گئے اور وہ خط ہاتھ میں دیا۔ حاجی صاحب جھنجھلا کر بولے ایسے لوں کا دماغ بھی خراب جاتا، خواہ مخواہ مجھ کو رسوا کرتے ہیں، دو ہی چار روز گزرے کہ اس طالب علم کے بھائی کا خط آیا کہ فلاں تاریخ فلاں وقت وہ طالب علم دفعۃً مجذوب

ہوگیا۔ خدا کے لئے دعائے صحت فرمائیں۔" اب حاجی صاحب بڑے ہی قلق اضطراب میں مبتلا ہو گئے اور مولانا کی خدمت میں حاضر ہوکر آنسوؤں کے ساتھ بڑے الحاح واضطرار کے عالم میں بولے کہ "حضرت آخر کیا کروں وہ فقرے میں نے کچھ دشمنی میں اور جان کر تھوڑے ہی کہے تھے بس جھنجھلاہٹ میں زبان سے نکل گئے تھے، میں تو اس نعمت سے عاجز آگیا ہوں۔"

دشواریاں عوام ہی کو نہیں خواص واکابر کو بھی پیش آتی رہتی ہیں اور ایسے ورطے سے نکالنا کام حضرت حکیم الامت ہی جیسے دقیقہ سنج مصلحین وحکما کا ہو سکتا ہے کسی محض بزرگ کا نہیں۔ حضرت نے فرمایا اس کا علاج بھی آپ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ اسی حربے سے کام لیجئے جو آپ کے پاس موجود ہے دعا کیجئے کہ اللہ اس نعمت عظیم کے بار کا تحمل اب مجھ ناتواں سے نہیں ہوتا۔ اسے بدل کر کسی دوسری نعمت سے سرفراز فرمایا جائے۔ دعا آپ اپنی زبان سے کیجئے جس کی مقبولیت کے یہ سب کرشمے ہیں، آمین میں بھی کہتا جاؤں گا۔ حاجی صاحب اس تشخیص اور معالجہ کو سن کر باغ باغ ہو گئے۔ عمل اسی وقت کیا اور یہ دعا بھی فی الفور قبول ہو گئی، یعنی اسی وقت سے وہ خاص کیفیت سلب ہو گئی۔

مولانا گنج مراد آبادی کا سال وفات غالباً ۱۳۱۳ھ ۱۸۹۵ء ہے اس کے بعد ہی حاجی صاحب اپنے مراتب کمال کی تکمیل مزید کے لئے ایک دوسرے شیخ وقت اور مرشد گر بزرگ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ان حاجی صاحب کے مرتبہ کا کیا کہنا مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد یعقوب نانوتوی، حکیم الامت تھانوی، مولانا محمد حسین الہ آبادی، مولانا احمد حسن کانپوری (شارح ومشہور ناشر مثنوی) وغیرہم کتنے اس شمع کے پروانے تھے جو آگے چل کر خود آفتاب و ماہتاب ثابت ہوئے۔ حاجی صاحب بھی اس نظر کیمیا اثر سے مستفید ہوتے اور اب قیام حرمین کا شوق بھی دل کھول کر پورا کرتے۔ ارض پاک کی حاضری کے ساتھ ساتھ مرشد کی بزم میں بھی حضوری ——— اب کون بتائے کون جانے کہ یہاں کیا کیا، کیا کیا پایا۔

جب ہوشوں میں اتنا ہوشیار دیوانوں میں اتنا فرزانہ مستوں میں اتنا بیدار کم تر ہی

کوئی گزرا ہوگا ایک طرف جوش و مستی سے لبریز دوسری طرف اتباع شریعت کا غایت
اہتمام اور بیت اللہ کے تو گویا عاشق زار تھے، نام لیتے آنسو چلنے لگتے تھے۔ وجہ معاش
بظاہر کوئی خاص اور کوئی معقول نہ تھی۔ اس پر بھی بار بار حج اور اس میں فراخدلی سے
خرچ جسے ایک مستقل کرامت ہی سمجھنا چاہئے ـــــــ خود ہی نہیں جاتے تھے دوسروں کو
بھی اپنے ساتھ لیجاتے تھے۔ بہتوں کی راستہ میں خبر گیری کرتے جاتے تھے حج کا موسم آتا تو جوش
و دیوانگی دیکھنے کے قابل ہوتا۔ اور عین چلتے وقت ریل پر بیٹھتے وقت تو معلوم ہوتا تھا
کہ بس ابھی دم توڑ دیں گے، وہ جوش گریہ وہ مستانہ اور پر خروش موعظہ و تقریر وہ آنکھوں
سے تڑپتی ہوئی بجلیاں جس نے اس پر اثر منظر کو دیکھا نہیں۔ اس کی سمجھ میں آنا اور یقین
آنا بھی دشوار ہے ـــــــ ہر دفعہ روانگی کے وقت لوگ یہی پیش گوئی کرتے تھے کہ اب
واپسی نہ ہوگی وہاں کی مٹی دبن لئے جا رہی ہے اور آخر کار زبان خلق کی اس منادی کا
ظہور اللہ نے عملی شکل میں کر ہی دکھایا۔

نماز اور روزہ اور جملہ اصناف عبادت کے ذوق و شوق شغف و اہتمام کا کیا حال
بیان ہو۔ دیکھنے سے اس کا تعلق تھا: تلاوت قرآن مجید کے علاوہ دوسرے اوراد و اذکار کے
خدا معلوم اور کن کن وقتوں میں کر ڈالتے تھے۔ ضعیفی میں شوق میں حفظ قرآن کا ہوا اور
شاید بھی اس پر کر گزرے۔ ظاہر اس سن میں حافظہ وہ کہاں سے آسکتا تھا۔ یاد کرتے
اور دہرانا مگر اولت نہ رکھتے تو پھر ذہن سے وہ جز نکل جاتا۔ خط میں حکیم الامتؒ کو لکھا
اپنی والی کوشش تو کی سب اب دعا یہ فرمایئے کہ یاد بھی رہ جائے۔ جواب آیا جس نے
بعمر شریف اپنا کلام یاد کرنے کی ہمت دی اس کے یاد کرنے کی بھی توفیق دیگا۔
سفر کے بڑے عادی تھے۔ عمر آخر تک دو چار برسوں کو چھوڑ کر جب سن ضعف
و امراض کا اثر جسم پر نمایاں ہونے لگا تھا۔ معمول ہمیشہ سیاحی ہی میں رہنے کا تھا آج
یہاں کل وہاں ابھی اس شہر میں ابھی کس شہر میں اور کبھی ایک ہی شہر کے اس محلے اس

محلے میں اور مالک مکان یا میزبان کو خبر تک نہیں، ذی مروت اتنے کہ کسی بات کو رد کرنا
جانتے ہی نہ تھے اہل حاجت اپنی غرض کے آگے اندھے باؤلے مسلسل نقل و حرکت ہی
میں رکھتے۔ ابھی اپنے ہاں کہہ کر کے گئے کہ دو گھنٹے میں واپس آ جائیں گے اور ابھی اپنا
ہی مستقل مہمان بنا لیا، نہ کھانے کا ٹھیک نہ سونے کا۔ جس نے جب اور جہاں پایا بس اپنے
کام کے لئے گرفتار کر لیا۔ مزاج میں سکنت اور سیر چشمی اتنی کہ جہاں جگہ ملی وہیں پڑ لئے مسہری
پلنگڑی کے بجائے کھرا تخت یا کھری زمین کا فرش ہی کافی کھانے میں موٹا جھوٹا کسی غریب
آدمی نے جو کچھ بھی پیش کر دیا بس اسی کو پوری رغبت اور شوق سے تناول فرما لیا۔ معمولات
شبانہ میں اس کثرت سفر کے باوجود نہ فرق آنے پاتا بہت رات گئے تھک کر اور چور ہو کر
لیٹتے ہیں مگر پھر دیکھئے تو اپنے وقت پر اٹھے بیٹھے ہیں اور یا نماز پڑھ رہے ہیں یا دعاؤں میں
مصروف ہیں یا اپنے اوراد پورے کر رہے ہیں۔

عملیات سے بھی ذوق رکھتے تھے۔ بلکہ اس فن کے بھی ماہر تھے اور عوام کی اس صنف
کے معتقد ہو کر ان پر پروانہ دار گرتے تھے۔ محض عوام ہی نہیں اچھے خاصے خواص بھی۔
اور ہر وقت تعویذ، نقش، گنڈے، فلیتہ کے لئے گھیرے رہتے تھے۔ حاجی صاحب کسی
کو بھی محروم و ناکام واپس نہ کرتے سب کی تعمیل فرمائش اپنا فرض جانتے، موم بتیاں جلا
کر تعویذ نقش وغیرہ لکھا کرتے کیا ٹھکانا ہے خدمت خلق کے اس شغف و انہماک کا
اصل کمال تو ان بزرگ کا ان کی عبدیت و شکستگی ہمہ وقت تضرع وابتہال تھا۔ لیکن ان
کمالات پر نظر تو خال خال کسی کی جاتی ۹۵ فیصدی مخلوق محض ان کے عامل ہونے کی حیثیت
سے ان کی گرویدہ رہتی اور سفر و حضر میں صحت و بیماری میں رات ہو کہ دن کسی حال میں
ان کا پیچھا نہ چھوڑتی تسخیر جنات کے قصے بھی اس سلسلے میں عجیب عجیب مشہور ہیں۔
باوجود کمال شورش و شوریدگی ضبط اور اپنے اوپر قابو بھی درجہ کمال ہی میں رکھتے
تھے اور احترام شریعت میں تو وہ حوصلہ و اہتمام تھا کہ باید و شاید ان کی زندگی آزاد اور

بے قید درویشوں کے لئے ایک مکمل درس ہدایت تھی. عارف رومی نے تو ایک جگہ آداب و داناؤں اور سوختہ جانوں کے دو گروہ الگ کرکے دکھائے ہیں اور صحیح دکھائے ہیں ؎

موسیا آداب دانان دیگر اند
سوختہ جان و روان دیگر اند

لیکن یہاں آداب دانی اور سوختہ جانی دونوں ایک ہی ذات میں متحد ہوگئی تھیں شریعت کے ساتھ ادنیٰ استخفاف کو نہیں برداشت کرسکتے تھے بہ ۱۹۳۱ء میں فتنہ نگار کے سلسلہ میں لکھنؤ کے امین الدولہ پارک میں مسلمانوں کا ایک جلسۂ عظیم نگار کی ملم آزار تحریر پر احتجاج کے لئے منعقد ہوا. تو میں نے ڈائس کے اوپر سے دیکھا کہ ایک پیر مرد قریب ہی بیٹھے ہوئے جوشیلے نعرے لگا رہے ہیں اور جوش سے بے خود ہوئے جا رہے ہیں. اس وقت تک حاجی صاحب کی خدمت میں نیاز حاصل نہ تھا. جلسہ کے بعد پوچھ پاچھ کی تو معلوم ہوا کہ بزرگ حاجی صاحب ہی تھے. حالاں کہ مدیر نگار سے قرابت بھی حاجی صاحب کی قائم ہوچکی تھی۔

فیاض و عالی حوصلہ بھی اس درجہ تھے. روپیہ خدا معلوم کہاں سے آتا تھا. اپنے عام نیاز مندوں سے طالب امداد ہونا تو کجا الٹے خود انھیں کی امداد اور وہ بھی اچھی خاصی رقموں سے فرمایا کرتے تھے. سنتا اس کو قرض دے رہے ہیں. ڈیڑھ سو اس کو اور یہ قرض بھی نام ہی کا قرض ہوتا تھا. دی ہوئی رقم وہ واپس قبول ہی کب کرتے تھے؟ مخلصانہ مذر لوگوں کی قبولیت خاص خاص مخلصوں تک محدود تھی. بدعتی رسوم اور رواج پرستی والے رواجی تصوف سے منزلوں دور رہتے. البتہ خلق مروت و نرم دلی کے باعث اہلِ بدعت پر کبھی زیادہ سختی نہ کرتے۔

دن رات میں خدا معلوم کتنی بار روتے اور رُلاتے رہتے. اُمت کی سابقہ عظمت کا ذکر آیا اور آن کے آنسو بہنے لگتے. ملت کی موجودہ پستی کا نام آیا اور اُن پر گریۂ بے اختیاری طاری ہوگیا. مخلص روتے ہی نہیں اسی حالت میں جوش و خروش کے ساتھ تقریر

بھی کرتے اور اللہ سے دعائیں بھی مانگتے کہ حق کے تو گویا امام ہی تھے، میں نے یہ جامع ا
پُراثر دعا، انھیں کی زبان مبارک سے سنی اور سیکھی۔

اَللّٰھم اغفر ذنوبنا و استر عیوبنا
واشرح صدورنا وحفظنا قلوبنا
ونوّر قلوبنا و یسّرنا امورنا
و حصّل مرادنا و تمم تقصیرنا
اَللّٰھم نجنا مما نخاف باخفی
الالطاف

اے اللہ ہمارے گناہ بخشدے اور ہمارے عیوب
ڈھانپ دے اور ہمارے سینوں کو کھول دے اور
دلوں کی حفاظت رکھ اور ہمارے دلوں کو
کردے اور ہمارے معاملات کو آسان کردے
اور ہماری مرادیں عطا کردے اور ہماری کوتاہی
کو پورا کردے اے اللہ ہمیں ہر اس چیز سے بچا
دے جس سے ہمیں ڈر معلوم ہوتا ہے اے لطف
کی دھن میں لگے رہنے والے۔

فرض نماز کے بعد جب سلام پھیر کر اور دعاؤں کے ساتھ یہ دعا پڑھتے تو مجسم الحاح
تضرع بن جاتے اللہم نجنا مما نخاف اس فقرے کو دو دو تین تین بار اور بڑے جوش و خر
کے ساتھ ادا کرتے، داڑھی آنسوؤں سے تر ہو جاتی۔

ہمارے گھر بھر پر خصوصی شفقت فرماتے تھے۔ عورتیں ان کی بے طرح معتقد تھیں
کوئی بیمار ہوا یا اور کسی قسم کی پریشانی لاحق ہوئی بس فوراً خط آیا آدمی حاجی صاحب کے
پاس دوڑا گیا اور آپ ہر ممکن دعا و تدبیر میں لگ جاتے۔ حضرت تھانوی کی وفات
بعد ہم لوگوں کا بڑا سہارا ایک انھیں کی ذات رہ گئی تھی اپنے متوسلین کا سہارا اس کی
ہاتھ لگ آتا ہے؟ تقسیم ملک کے بعد جب سے لکھنؤ کے مشہور مدرسہ فرقانیہ پر زوال
شروع ہو گیا تھا حاجی صاحب اب اس کا بڑا آسرا رہ گئے تھے۔ خود وہیں جا کر مستقل
اختیار کر لیا اور ہمت کر کے اس کی گرتی اور ڈوبتی ہوئی حالت کو سنبھال لیا۔
حرم پاک کی خاک تو اتنی مرتبہ چھانی تھی کہ گویا وہیں کے ہو گئے تھے حجاز

دروازہ پر سعادت سفر اس ضعیفی میں اور ظاہری عسرت کے باوجود ان کے نزدیک کوئی
ہی نہ تھے ابھی معلوم ہوا کہ بمبئی گئے ہیں اور ابھی خبر سنائی دی کہ جہاز پر بیٹھ کر فلاں فلاں
اپنے ساتھ لے کر مکہ روانہ ہو گئے اور جن لوگوں نے حاجی صاحب کو حرمین میں دیکھا ان کا بیان
وہاں پہونچ کر حاجی صاحب بوڑھے معلوم ہی نہیں ہوتے تھے بسو نوجوانوں کے ایک جیسے ہو
تھے نہ پیادہ چلنے سے تھکن نہ کھڑے رہنے سے۔ مدینہ منورہ میں مواجہ شریف کے سامنے
ہوئے سلام پڑھ رہے ہیں یا دعائیں کر رہے ہیں تو بس اب کھڑے ہی ہوئے ہیں۔ جو ان
تھک کر بیٹھ گئے ہیں لیکن ان کے ہاتھ دعا کے لئے اُسی طرح اٹھے ہوئے ہیں روتے جاتے
اور رو رو کر درد دل اس طرح سناتے جا رہے ہیں حق تھا کہ یہ خاک کا پتلہ وہیں کی خاک کا
بنے اور ایسے عالم میں دعوتِ اجل کو لبیک کہے کہ حشر تک مسلسل حج ہی میں گزرے وہی ہوا
بندے نے چاہا وہی اس کے مولا نے بھی چاہا۔ ؎

توچنیں خواہی خدا خواہد چنیں
می دہد یزداں مرادِ متقیں

برائے نام بیماری کے بعد پیا اپنے رب کا عاشق اور متوالا اور اس کے رسولؐ کے نام کا
۹ ذی الحجہ کی سہ پہر کو احرام پہنے ہوئے اپنے مالک و مولا سے جا ملا اور بسال کی مبارک
شب عرفات میں قبل عشا۔ مکہ معظمہ کے مشہور گورستان جنت المعلیٰ میں صحابیوں اور اولیا
کے جوار میں راحت کی ابدی نیند سو گیا۔ وہی یوم عرفات جس کے لئے دنیا کے سب
سے سچے کا ارشاد ہے کہ شیطان آج سے زیادہ مایوس کسی دن نہیں ہوا۔؟
قیامت تک رحمتیں اور برکتیں نازل ہوتی رہیں اس کی تربت پہ !

پیکرِ اخلاص کی وفات

ہندو پاکستان کے مسلمانوں میں کوئی مجھ سے اگر فرمائش کرتا کہ دس مخلص ترین انسانوں کے نام بتاؤ، تو اس ننھی منی سی فہرست میں میرے علم ولیقین کے مطابق ایک نام مولوی حافظ لقاء اللہ عثمانی پانی پتی کا ضرور ہوتا۔ افسوس ہے کہ وہ شمع اپنے وطن میں ۲۳ر جنوری (۱۴ر ذی قعدہ) کی شام کو بجھ کر۔ گو مخلص نایاب نہیں۔ ماشاء اللہ اچھی بڑی تعداد میں ہیں لیکن لقاء اللہ عثمانی ان میں گل سرسبد تھے۔ بڑے بلند اور امتیازی مرتبہ کے تھے۔ بیعت حضرت تھانوی سے تھے۔ تحریک خلافت و ترک موالات میں شیخ کے زیرِ عتاب بھی ایک عرصہ تک رہے لیکن بالآخر بحال ہو گئے۔ قومی و ملی کاموں میں بہت پیش پیش رہے۔ کامل تدین و اخلاص کے ساتھ۔ ادنیٰ ادنیٰ خدمت گار کے ساتھ گھل مل کر کام کرتے۔ اور دوسروں کی خدمت ہی کر کے خوش ہوتے جب میں انگریزی تفسیر و ترجمۂ قرآن کا کام کر رہا تھا ایک بار حیدرآباد جانا ہوا مرحوم اس وقت وہیں تھے اور قلیل معاوضہ پر ایک ملی خدمت کر رہے تھے۔ مجھ سے ملنے تشریف لائے تو مجھے اٹھا کر تنہائی میں لے گئے اور بڑی لجاجت سے بولے کہ میری ایک نذر قبول کر لیجئے۔ جیب سے ایک روپیہ نکالا اور بڑی خاکساری سے ہاتھ بڑھا کر کہا اتنی قلیل رقم پیش کرتے مجھے شرم آتی ہے لیکن آپ قبول کر کے میری ہمت افزائی کریں گے۔" میں نے عرض کیا کہ مولانا یہ آپ کیا فرما رہے ہیں۔ آپ کے عطیہ کو تبرک سمجھ رہا ہوں اور اسے شریک کر لینے سے خود اپنی عزت افزائی سمجھ رہا ہوں۔ ایسی حلال کمائی کا جز نصیب کسے ہوتا ہے۔"!

گاندھی جی کو ۴۷ء میں جن دو چار مسلمانوں پر آنکھ بند کر کے بھروسا تھا۔ ان میں ایک یہ حضرت بھی تھے۔ اور گاندھی جی کا منصوبہ یہ تھا کہ اسپیشل ٹرین لے کر جب

از صدق جدید ۷ر فروری ۱۹۶۹ء

ستان جائیں گے یہاں سے ہندوؤں کو واپس جانے کے لئے اور ادھر سے والپسی جہازوں
ساتھ لاکر یہاں از سرِ نو بسانے کے لئے تو جو مسلمان مشیروں اور معاونوں میں ان کو
ر ساتھ رکھیں گے ـــــــ ۴۷ء میں دہلی ہی کی طرح پانی پت کے مسلمانوں پر بھی قیامت
لیکن اس محترمہ توکل نے کسی طرح ترک وطن گوارہ نہیں کیا اور بالآخر اسی آگ کی بھٹی
نے حق میں گلزار بنالیا! ـــــــ کل دو ہفتے ہوئے ارجنوری کا لکھا ہوا تعزیت نامہ
رفیقۂ حیات مرحومہ کے سلسلہ میں آیا تھا کہ آپ نامناسب نہ سمجھیں تو ان کا نام مجھے لکھ
یں تاکہ میں اپنی ایصال ثواب والی فہرست میں ان کا نام درج کرلوں۔ اور پابندی
کے لئے دعائے مغفرت کرتا رہوں کون جانتا تھا کہ اتنی جلد خود دعا کرنے والا اسی
یں پہونچ جائے گا۔ !

سلف صالحین کی ایک صحیح اور سچی یادگار بھی آخر ہماری ظاہری نظروں سے
وش ہوگئی۔ اللہم اغفرلہ وارحمہ

مولوی عبدالحلیم صدّیقی مرحوم[1]

لکھنؤ کی خبر ہے کہ مولانا عبدالحلیم صدیقی نے یکم فروری کو ملیح آباد (ضلع لکھنؤ) میں وفات پائی۔ ایک لمبی مدت سے فالج میں مبتلا تھے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ جمعیۃ العلماء ہند کے نامور خدمت گزاروں میں تھے۔ اور مدتوں اس کے عہدہ داروں میں رہے۔ خلافت کمیٹی کے بھی ممتاز کارگزاروں میں تھے اور جیل بھی گئے۔ برسوں دارالعلوم ندوہ میں اور اس کے بعد برسوں مدرسہ عالیہ کلکتہ میں معلمی کے فرائض انجام دیئے۔ حضرت مولانا حسین احمد سے نسبت وبیعت اجازت خلافت تھی۔ مشاق اور بے تکان بولنے والے تھے۔ وفد کے ممبر کی حیثیت سے حجاز بھی گئے۔

لکھنؤ، دہلی، بمبئی، بھوپال وغیرہ ہندوستان کے ہر حصہ میں معتقدین اور جاننے والے کثرت سے ملیں گے۔ اسلامی وعربی علوم خاص مناسبت صرف ونحو سے تھی۔ راقم السطور نے کئی بار عرض کی کہ اعراب القرآن کے موضوع پر جدید مکمل کتاب اپنے قلم سے لکھ دیجئے۔ دوستوں کو خوب کھلاتے پلاتے اور اپنی حیثیت سے بڑھ کر ان کی خاطر داریوں میں لگے رہتے۔ اپنی خوبیوں کی بنا پر اپنے نیازمندوں کو مدتوں یاد آتے رہیں گے۔ اچھے جیّد حافظ قرآن تھے رمضان شریف میں تراویح خوب ہی پڑھاتے تھے اور سنہری مسجد (دہلی) میں سننے والے بڑے شوق سے جمع ہو جاتے۔ اللھم اغفرلہ وارحمہ

---

[1] صدق جدید ۱۱ فروری ۱۹۶۲ء

ایک مثالی شخصیت

افضل العلماء عبدالحق کرنولی مرحوم

۱۰ مارچ سہ پہر کو تازہ ڈاک دیکھ رہا تھا کہ نظر معاصر انجمیتہ کی ایک نمایاں خبر پر پڑی کہ ڈاکٹر عبدالحق چیرمین مدارس سروس کمیشن کا دفعتہً انتقال حرکت قلب بند ہو جانے سے ہو گیا ــ زبان پر اضطراراً اناللہ تو آگیا، لیکن دماغ کے اندر ایک شدید ہیجان و تلاطم برپا، نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ وہ عبدالحق ہرگز نہیں۔ یہ ذکر ان کے کسی ہم نام کا ہوگا۔ خبر پھر پڑھی اور پھر پڑھی، پُر نم آنکھوں کے سامنے الفاظ بھی دھندلے ہو گئے۔ عبارت پوری پڑھی بھی نہ ہوگی پھر اتنی تو چل ہی گئی کہ مفہوم سمجھنے میں کوئی شک و اشتباہ نہ رہا ــ ایک دو سکنڈ بھی بہت ہوئے اسی مدت کے اندر دماغ اسی طرح تہ و بالا ہو گیا۔

اونچے سرکاری عہدہ دار تھے اسٹیٹسمین وغیرہ انگریزی روزنامہ میں ضرور نکلی ہوگی لیکن میری نظر سے اس دن کہیں اور نہیں گزری ــــــ ہند کے موجودہ انگریزی اخبارات کے تجربے مسلمان اکابر و مشاہیر کی وفات کے سلسلہ میں بخل کے بھی اچھے خاصے ہو چکے ہیں۔ ابھی اسی جنوری کی ۲۶ جنوری دس بجے مجھے کسی طرح ہنسی خوشی کرنول اسٹیشن سے رخصت کیا تھا۔ کیسے خوش و خرم توانا تندرست ہشاش بشاش اس وقت تھے وہی چہرہ نظر کے سامنے برابر پھرے جا رہا تھا۔ دعائیں بار بار اور دیر تک مرحوم کی مغفرت اور بلند درجوں کے لئے مانگیں۔ یہ بھی گویا اضطراراً ہی تھا ورنہ پختہ مومن

صدق جدید ۵ مئی ۱۹۵۵ء

ومر وصالح کے لئے دعائے مغفرت بس ایک تحصیل حاصل سی تھی۔

مرحوم کا نام اول اول محمڈن کالج مدراس کے پروفیسر اور پھر پرنسپل کی حیثیت سے سننے میں آیا پھر وہ شاید اسسٹنٹ ڈائرکٹر بننے کے بعد سرکاری پریسیڈنسی کالج کے پرنسپل ہوگئے۔ یہ اسوقت ایک ہندوستانی خصوصاً ایک مسلمان کے لئے غیر معمولی اعزاز تھا کوئی چھ مہینے کے لئے مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں پرو وائس چانسلر اور پھر قائم مقام وائس چانسلر رہے اور اتنے ہی دن میں کیا اپنے قول اور رائے ظاہر سے اور کیا اپنے عمل و باطن سے لڑکوں اور استادوں دونوں میں ایک اسلامی انقلاب کی داغ بیل ڈال دی گویا وقار الملک مرحوم کا دور لوٹ آنے لگا۔ مسجدوں میں نمازیوں کی تعداد بڑھنے لگی اور ترکی ٹوپی، ۱۹۴۷ء کے بعد سے اُردو ہی کی طرح غیر ملکی یا پاکستانی قرار پاچکی تھی۔ از سر نو سروں پر نظر آنے لگی پھر وطن جاکر اپنے صوبہ کے پبلک سروس کمیشن کے ممبر مقرر ہوگئے اور حال ہی میں ترقی پاکر اس کے صدر ہوگئے تھے۔ افضل العلماء کی سند مدراس یونی ورسٹی سے پاس کرکے حاصل کی تھی اور خان بہادر کا خطاب انگریزی حکومت سے پاچکے تھے

وطن کرنول (علاقہ آندھرا) تھا والد ماجد مولانا محمد عمر نقشبندی، کہ ان کے انتقال کو ابھی زیادہ زمانہ نہیں گزرا ایک بڑے پائے کے عالم تھے تعلقات بزرگان دیوبند و بنگال سے دونوں مخلصانہ اور گہرے رکھے ہوئے تھے، ہونہار صاحبزادہ کو خوب انھوں نے مشرقی تعلیم اور دینی تربیت سے آراستہ کیا بہت کم سنی میں سارے علوم سے فراغت کرلی۔ افضل العلماء ہوئے، پرانگریزی کی طرف توجہ کی اور کھٹا کھٹ امتحان پاس کرنے شروع کردیے۔ کچھ ہی دنوں میں ایم۔ اے۔ پر جاکر دم لیا۔ اس کے بعد ڈاکٹریٹ (ڈی فل) کی ڈگری آکسفورڈ دوبار جاکر رہے اور حج بیت اللہ کی سعادت بھی دو ہی بار حاصل کی نظر ادگہری نظر یوں تو خدا معلوم کتنے علوم و فنون پر رکھتے تھے۔ لیکن موضوع اصلی

دو تھے ایک عربی ادب دوسرے تاریخ اسلامی۔ معقولات قدیم سے بھی ذوق کچھ کم نہ تھا۔
شیخ الاشراق شہاب الدین مقتول سہروردی کی کتاب ہیاکل النور پر شرح ملا جلال الدین
دوانی صاحب اخلاق جلالی کے قلم سے شواکل طور کے نام سے ہے۔ اسے ایک رفیق کے ساتھ
ترتیب و تہذیب کے بعد شائع کی اس پر عربی میں مقدمہ لکھا حاشیے دئیے اور ڈگری
پی ایچ ڈی حاصل کی تازہ کارنامہ دیوان اکلیل الملک کی ترتیب تہذیب و اشاعت ہے آکسفورڈ
کی دوسری ڈگری شائد اسی پر ملی ـــــ ذہین، حافظہ، ذوق سلیم، شوق علم و جستجو کے سارے
عناصر موزوں اکھٹے ہو گئے تھے علم و ادب کے کسی کوچے میں بھی نکل جاتے ہاتھوں ہاتھ لئے
جاتے اردو ادب کا بھی بڑا پاکیزہ مذاق رکھتے تھے۔ لکھنؤ کی زبان کے عاشق تھے فسانہ
آزاد کی عبارتیں صفحہ کی صفحہ کی ازبر تھیں

بیعت حضرت تھانوی نے مراسلت کے ذریعہ سے ان کی کم سنی میں ہی منظور فرمائی تھی اور
یہ امتیاز حضرت کے منتسبین میں نادر ہی کسی کے حصہ میں آسکا۔ اور مرشد کے ساتھ
یہ نسبت عشقی قائم تھی دینی مسائل میں حضرت مولانا حسین احمد کے ساتھ بھی عقیدت
بڑی گہری تھی اور چونکہ طبیعت بڑی عملی واقع ہوئی تھی عقیدت کے دائرہ میں بھی اس کا
اظہار کرتے تھے چنانچہ دو ہی چار سال ادھر جب مولانا کا جانا جنوبی ہند میں ہوا تھا تو
کرنول میں انھوں نے شیخ سے باقاعدہ درس حدیث (صحیح بخاری) کا دلایا۔ اور کم سے کم
ایک درس کو تو پورا کا پورا ریکارڈ میں بھر لیا جس سے جب چاہے خود مستفید ہو لیتے اور دوسروں کو
مستفید کرتے۔ عقائداً اہل سنت میں اس قدر راسخ اور پختہ ہونے کے باوجود تعصب کسی
بھی فرقہ سے نام کو نہ تھا "وہابی" "بدعتی" "خارجی" رافضی یہاں تک کہ قادیانی سب سے
یکساں کشادہ دلی سے ملتے۔ درسگاہوں میں حسب شان معلم مقرر کرتے ان کے ذاتی مفاد سے
کہیں زیادہ ان کے کام ان کی اہلیت ان کی استعداد ان کی ذہانت ان کی مزاج شناسی اور

ان کے ظرف و اخلاق پر نظر رکھتے۔ اور کچھ ایسا ہی حال ان کی سرکاری زندگی کا بھی تھا۔ جس عہدہ پر بھی ہوتے مسلمانوں کی نفع رسانی میں بے دریغ اور دھڑلے سے لگے رہتے لیکن کسی غیر مسلم کے ساتھ نہ ناانصافی کرتے نہ اس کی حق تلفی کرتے نہ کسی حیثیت سے اسے شکایت کا موقع دیتے اور اس باب میں وہ سابق حیدرآباد کے صاحب وزیر خزانہ اور پاکستان کے مرحوم گورنر جنرل ملک غلام محمد کے سے تھے ـــــ شدید مذہبیت اور دینداری کے باوجود تقشف چھو نہیں گیا تھا۔ خندہ روئی کے ساتھ ہر چھوٹے بڑے سے ملتے اور بجائے فکرمندی یا جھنجھلاہٹ کے ہر کام بڑے ہی سکون خاطر و انبساط کے ساتھ نمٹاتے تھے۔ نفس مطمئنہ کی اصطلاح صوفیہ نے جس معنی میں بھی استعمال کی ہو اس کی جھلک تو اس مرد مومن کی زندگی میں بھی دیکھنے میں آگئی۔

سرکار دربار میں جن مسلمانوں کی رسائی ہے ان میں اکثر سے اس نیازمند کو بھی نیاز حاصل ہے۔ اور بعض سے تو بے تکلفی کی حد تک بیشتر کے ہاں عالم یہی پایا۔

؎ جو بچے بہت تو بچے ذرا جو گھری کبھی دھرے گئے "

(مصرع کے آخری ٹکڑے کو یوپی کے ایک پارلیمنٹری سکریٹری کا پورا طرح چسپاں ہوتے ہوئے دیکھا) اس اکثری اور عمومی قاعدہ سے مستثنیٰ پایا تو عبدالحق کو جو وضع اور جو طریقہ اپنا شروع سے رکھا اس پر آخر تک اسی طرح قائم رہے۔ وہی نماز وہی روزہ وہی معمولات وہی داڑھی وہی ترکی ٹوپی وہی شیروانی وہی پاجامہ۔ خودداری کیا تھی اور شخصی کردار کی ایسی مثالیں کم ایسے کم دیکھنے میں آئی ہیں۔ ہر پارٹی، ہر تحزب ہر فرقہ بندی سے بھی غیر متاثر رہنے کی کوئی دوسری مثال مشکل ہی سے ملے گی۔ عقیدت بزرگان دیوبند کے ساتھ انتہا کی تھی لیکن اس کے بھی حدود تھے اور توازن قائم تھا۔ سر سید کے مذہبی عقیدوں سے بیزار مگر ان کی تعلیمی کوششوں کے بڑے قائل اور مداح تھے۔ بلکہ جنوبی ہند کے حدود میں تو گویا دوسرے سر سید خود بن گئے تھے۔ اسکول کالج دارالعلوم کتنے قائم کر دیئے اور کرا دیئے اور کتنی درسگاہوں کے

کے رَوح رواں اور سرپرست تھے! انھیں میں زنانہ درس گاہیں بھی تھیں، لیکن بے حجابی کے قائل ذرا بھی نہ تھے۔ اپنی والی ہر کوشش ہر زنانہ اسکول اور کالج میں پردہ کی پابندی کی تھی۔ خود اپنی صاحبزادی کو ایم۔اے کرایا۔ لیکن مذہبی تربیت کے پورے لوازم کے ساتھ۔ چنانچہ وہ ایک والہانہ ذوق وشوق کے ساتھ حج بھی کر آئی ہیں اور حجاب کا یہ اہتمام ہے کہ میں نے اسی گھر میں اپنے آٹھ دن کے قیام میں ایک بار بھی انھیں یا ان کی والدہ کو برقع کے ساتھ بھی باہر نہیں دیکھا۔ کسی کو سخت سست کہنا اور غیبت کرنا تو جیسے جانتے ہی نہ تھے یہ بات چھوٹی اور معمولی نہیں۔ بس معاشرے میں غیبت و بدگوئی خصوصاً معاصرین کی، ایک مستقل عادت بن چکی ہو، اور عوام نہیں، خواص بھی بری طرح اس میں لت پت رہتے ہوں، وہاں زبان پر اتنا قابو رکھنا ایک بڑا اور غیر معمولی وصف سمجھا جائے گا۔ بلکہ ایک طرح کا مجاہدہ۔ ولا یلقاھا الا الصابرون۔ بعض اوصاف ایسے تھے کہ ان کی بنا پر ان پر گمان ولی اللہ ہونے کا گزرتا تھا جس دن اپنی محبوب لڑکی کا عقد کیا اسی دن بستی کی ایک نہیں سات یتیم لڑکیوں کا بھی عقد کر دیا اور اسی ساز و سامان کے ساتھ! اس کی اہمیت و معنویت ذرا سوچنے کے بعد ہی منکشف ہوگی۔ ہم جیسے دنیا پرستوں کا حال تو اس کے بالکل برعکس ہے۔ ہم سے اگر ہماری لڑکی کی شادی کے دن کسی دوسری لڑکی کے لئے امداد چاہی جائے تو الٹا غصہ آجائے۔ اور ہم مانگنے والے پر برس پڑیں کہ یہاں اپنی ہی لڑکی کے لئے انتظام کس مشکل سے ہو پایا ہے کہ یہ چلے ہیں سوال کرنے! ۔ کیا ملکوتی ظرف رہا تھا جس نے فیاضی کو اس موقع پر اور اس پیمانہ پر راہ دی!

بزرگی، مقبولیت، عبدیت کسی مخصوص طبقہ کی جاگیر نہیں۔ لوگ اہل اللہ کی تلاش میں نکلتے ہیں تو اپنی نظریں صرف بندگی کی جگہوں، آستانوں، درس گاہوں، خانقاہوں تک محدود و محصور رکھتے ہیں۔ کسی کو کیا خبر کہ زندگی کے ہر کوچہ اور ہر گوشہ میں کیسے کیسے

صاحبِ دل موجود ہیں! اس تباہ کار کو اپنی زندگی میں اچھے اچھے بزرگوں کی صحبت رفاقت کی سعادت نصیب ہورہی ہے لیکن نگاہ عیب بیں کو سابقہ کے بعد اکثر مایوسی ہی نصیب رہی کے دو ہی چار ہستیاں ایسی ملیں جہاں عیب جُو کی نگاہ دھک کرنا کام رہی اور انھیں مستثنیات میں ایک ذات ان مرحوم کی تھی۔ انکساری، اخلاص، ایثار و شرافت کا ایک چلتا پھرتا پتلا تھا جسے لذت ہی خدمتِ خلق میں آتی تھی، مجھ سے سن میں کل ۸۔۹ سال چھوٹے تھے اور علم میں اور دنیوی اعزاز میں جو مرتبہ تھا، وہ ظاہر ہی ہے مگر برتاؤ یہ رکھا تھا کہ جیسے مجھ سے ۲۰۔۲۲ سال چھوٹے اور ہر طرح میرے ماتحت ہی ہوں۔ مدراس و کرنول دونوں جگہ ان کی مرجعیت و مقبولیت کا عالم دیکھ کر دل وہم آشنا نے یہ کہا کہ ایسا نہ ہو، یہ قبول خلق کا فتنہ انھیں لے ڈالے۔ چنانچہ آخری مصافحہ کے ساتھ جب گاڑی پر بیٹھنے لگا ہوں اور انہوں نے اپنے عام انکسار و تواضع کے ساتھ دعا کی فرمائش کی، تو زبان پر الفاظ کچھ اس قسم کے آسکے تھے کہ اللہ کے اخلاص کو قائم رکھے بلکہ روز افزوں اس میں ترقی دے، اخلاص پیدا ہوجانا زیادہ دشوار نہیں، اصل مشکل اس کو قائم و برقرار رکھنے کی ہے قبول خلق کی لذت نفس کے لئے بری چاٹ حکیم مطلق کی حکمتوں اور مصلحتوں کے سامنے کون دم مار سکتا ہے ورنہ ظاہری عقل تو ہم حقیر بندوں کی یہ سمجھنے سے بالکل عاجز ہے کہ ہمارے اپنے صوبے میں ایک بہترین دینی خدمت گزار کو نسبتاً کم عمری ہی میں مفلوج کرکے بے کار کردیا گیا اسی طرح اس کل ہند مخلص ترین و سرگرم ترین ملی خدمت گزار کو عین اس کی توانائی کے زمانہ میں بے نشان و گمان دفعتہً اٹھا لیا گیا! — یہ بھی یقیناً رحمتِ الٰہی کا ایک کرشمہ ہوگا کہ بس بندے کا امتحان پورا ہوگیا، بابِ حیات سنعاد کی امانت جو عطا ہوئی تھی اس کا حق تو نے ادا کردیا۔ اب مزید تعب و مشقت اٹھانے کی اور اپنے وطن اصلی کی بے حد و حساب راحتوں سے دور رہنے کی ضرورت اب ایک لمحہ ایک پل کے لئے بھی نہیں! اور فوراً آ، کہ انعامات اب خود تیرے لئے خود تڑپ رہے ہیں۔ ارجعی الی ربک راضیۃً مرضیۃً فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی۔

شیخ التفسیر کی وفات[1]

جس وقت کا دھڑکا تھا وہ آ گیا آخر

چھیوں نہیں بلکہ شاید برسوں موت و زلیست میں جھولنے کے بعد شیخ التفسیر ندوۃ العلماء مولانا محمد اویس ندویؒ نے جمعہ ۸ اگست لکھنؤ میں وفات پائی۔ یہ ندوی عالم نگرامی تھے۔ ان کے والد ماجد مولانا محمد انیس نگرامی اور ان کے دادا مولانا محمد ادریس (صاحب احکام القرآن) تھے۔ یہ خاندان اہل علم کا تھا۔ اس میں ان کے ایک عزیز قریب مولانا عبد الرحمٰن نگرامی ندوی شیخ التفسیر تھے (متوفی ۱۹۲۶ء) اور مولوی محفوظ الرحمٰن اور مولوی مطلوب الرحمٰن۔

مولوی اویس کو شروع ہی سے ندوہ اور اہل ندوہ کی تربیت ملنے لگی تھی، تقریر و تحریر دونوں میں ہونہار نکلے۔ دار المصنفین خاص تربیت گاہ رہی اور ان پر مولانا سید سلیمان ندوی کی نگاہ کرم خصوصیت سے رہی معارف میں ان کے مقالات خاص طور پر جگہ پاتے گئے۔ مولانا عبد الرحمٰن نگرامی سے نہ صرف تفسیر قرآن کا درس لیا بلکہ علم و فضل، اخلاق، ملنساری اور تواضع میں بھی ان کے قدم بہ قدم رہے۔

ابن قیم کی تفسیریں جستہ جستہ کر کے اکٹھی کیں اور رکھا جائے کہ بہتر طریقے سے ایڈٹ کیں۔ اس طرح سے تفسیر ابن قیم وجود میں آ گئی۔ اور اپنے دادا مولانا ادریس کی ایک فقہی تفسیر کے دوسرے ایڈیشن کو اس وقت ایڈٹ کر رہے تھے۔ قرآنی تالیفات کا بہترین ادارہ قائم کر رہے تھے اور بیسیوں نہیں پچاسوں قرآنی موضوعات تیار کر چکے تھے۔ اپنے محترم و شفیق استاد مولانا سید سلیمان ندوی کی کلاسیکل سیرت النبی کے نئے ایڈیشن پر نظر ثانی شروع سے آخر تک کر ڈالی

---

[1] صدق جدید ۱۰ ستمبر ۱۹۷۶ء

کی تو تصنیف و تالیف ہوئی۔ باقی تعلیم و تدریس کا تعلق ہے اس میں عمر عزیز کے سالہا سال
گزارے۔ اور اپنے درس میں قرآن مجید سے خاص ذوق اپنے شاگردوں میں پیدا کر دیتے تھے۔
تفسیروں میں روح المعانی (آلوسی عراقی) سے خاص ذوق رکھتے تھے اور دوسری مستند
تفسیروں پر اگرچہ پورا اعتماد رکھتے تھے لیکن کسی کے قول سے انکار نہ تھا۔ اور ہر مناسب تر قول
کو قبول کر لینے پر تیار رہتے تھے۔ اور اس اعتبار سے اپنے معاصرین و ممتاز و نادر تھے بلغیر مہدی
سے میرے علم میں تین شخص حسن ظن انتہائی مبالغہ کے ساتھ رکھتے تھے اور اب یہ تینوں شخص
دنیا سے سفر کر گئے ان میں ایک مولانا عبدالباری ندوی دوسرے شفاء الملک حکیم شمس الدین اور
تیسرے یہی مرحوم۔ اللہ انھیں بڑے سے بڑے مرتبہ پر پہونچائے۔

سیاسی لیڈر

"شب برات" ایک خیر و برکت والی رات ہے۔ کسے خبر تھی کہ یہ شب شب قیامت یا نمونۂ شب قیامت بھی بن سکتی ہے؟ مسلمان تو اس رات کو جاگ جاگ کر گزارتے ہیں کون کہہ سکتا تھا کہ اب کی اس رات کو ان کا نصیبہ سلا دیا جائے گا؟ زندگیاں مانگتے ہیں صحتوں کے لئے گڑگڑاتے ہیں، کسے خیال تھا کہ عین اسی وقت اُسے اٹھا لیا جائے گا، جس کے وجود سے ملتِ اسلامیہ کا وجود تھا۔ جس کی زندگی ساری قوم کی زندگی تھی۔ اور جس کی موت، اللہ کا نام جپنے والوں کی موت محمدؐ کا کلمہ پڑھنے والوں کی موت ہے! اس پچھلے زمانہ میں مسلمانوں پر کیا کیا نہیں گزری، کیسے کیسے اکابر اٹھا لئے گئے۔ ہندوستان کے اندر اور ہندوستان کے باہر کیا کچھ جھیلنا نہیں پڑا۔ انگریزوں نے رگیدا، ہندوؤں نے دبایا، ترکوں پر اتحادیوں کا نرغہ ہوا، شریف نے بغاوت کی مدینہ کی بستی تباہ ہوئی، مکہ لٹا، خلافت مٹی، افغانستان تہ و بالا ہوا، عراق میں خاک اڑی، مصر کا سردار اٹھ گیا، شام میں آسمان رویا، فلسطین میں زمین کانپی، یہ سب کچھ ہوا اور ہوتا رہا، ایک محمد علی کا دم، ہر زخم کے لئے مرہم تھا، ہر تازہ صدمہ کے وقت، دل کو ذرا تسکین ہوتی تھی، تو اس خیال سے کہ جو کچھ بھی چلا جائے محمد علی تو ہم میں موجود ہے۔ آہ۔ کہ شعبان ۱۳۴۹ھ کی شب مبارک کو یہ آخری سہارا بھی چھن گیا اور جس پاک بے نیاز نے محمدؐ کے لئے منادی کردی کہ ما محمد الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل افان مات او قتل انقلبتم علی اعقابکم اس کے فرشتوں نے اس کے بندوں تک محمدؐ کا ایک نادم غلام محمد علی کے لئے بھی یہی صدا پہونچا دی۔

سچ لکھنؤ سنہ ۱۹۳۱ء

اے پاک پروردگار! اے سب کو جلانے والے اور سب کو اٹھانے والے مولا، تیرا ارادہ [بے] شک سب کے ارادوں پر حاکم، تیری حکمت و مصلحت قطعاً سب کی حکمتوں اور مصلحتوں پر غالب، [تیر]ی مشیت بلاشبہ آن کی آن میں ہر بہار کو خزاں، ہر ہنسی کو رنج، ہر عید کو محرم بنا دینے پر [قادر] ہے لیکن کیا ہم جیسے ناتواں و کمزور بندوں کا ظرف اتنی سخت آزمائش اتنے بڑے ابتلا [اور اتن]ے کڑے امتحان کے قابل تھا! ایسی آزمائش تو ابرار و کاملین کی ہوا کرتی ہے ہم کم ظرف [اس] لائق تھے کہ جس گھڑی تیری رحمت کے سب سے زیادہ بھوکے ہوں تیرے فضل و کرم [کی بھ]یک کے لئے تیرے آگے ہاتھ پھیلائے گڑگڑا رہے ہوں، عین اس وقت ہماری سب سے [بڑ]ی زندہ دولت، ہماری سب سے زیادہ قیمتی کمائی، ہماری سب سے عزیز پونجی ہمارے ہاتھوں [سے ی]وں نکل جائے، اور دل ہارتا تھا جس کی موت کی خبر کبھی نہ سننی پڑے، اسے دم توڑتے [آ]نکھوں سے دیکھیں اور لاشے کو اپنے کاندھے پر اٹھائیں! تیری جناب میں وفی گستاخی [تص]ور میں نہیں لایا جا سکتا لیکن اے کمزوروں اور ناتوانوں کی خبر رکھنے والے مالک! انصاف [جب] تیرے حبیبؐ و محبوبؐ کو اس عالم ناسوت سے کوچ کرتے دیکھ کر جب فاروق اعظمؓ کا قلب [تاب] نہ لا سکا، تو تیرے اس حبیب پاکؐ کے ہمنام غلام کے غم مفارقت میں اگر ہم کم ظرفوں کی [عق]ل ڈگمگا نے لگیں تو ہماری فطرت سے کچھ بعید ہے! ہم نادان و نابینا تو ادنیٰ سی ادنیٰ [آزما]ئش کا تحمل نہیں کر سکتے، وقت کی اس سب سے بڑی اور سب سے کڑی آزمائش کے لئے [صبر] کس سے مانگ کر لائیں۔
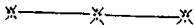
✕———✕———✕

جلسے ہو رہے ہیں، تقریریں ہو رہی ہیں، مرثیے لکھے جا رہے ہیں، تجویزیں پاس ہو رہی ہیں [کہ] قوم کا لیڈر اٹھ گیا، نیشنل کانگریس کا سابق صدر چل بسا، ہندو مسلم اتحاد کا علمبردار رخصت [ہوا] یہ سب کچھ صحیح ہوگا، لیکن یہ کسی کی زبان پر نہیں آتا کہ اللہ کا بندہ اٹھ گیا اپنے [رب کا] پرستار چل بسا، محمدؐ کے نام کا عاشق زار رخصت ہوگیا! آج ماتم اس کا نہیں کہ ایک

جادو بیان، معزز اور بہترین انشا پرداز گم ہوگیا۔ ماتم اسی کا ہے کہ وہ گم ہوگیا، جو سچائی کا پتا تھا، جو حق گوئی کا مجسمہ تھا، جس نے اپنی دنیا برباد کرکے اپنی عاقبت بنائی تھی، جس نے اپنی مرضی کو اپنے مولا کی رضا میں فنا کردیا تھا، جس نے زریں لباس چھوڑ کر فقر و فاقہ کی زندگی اختیار کی تھی، جس نے بیش قیمت سوٹ اتار کر جیل کی کملی اوڑھ لی تھی، جس کے دل میں سکتے جاگتے، چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے اگر دھن تھی تو اللہ کے دین کی، اور ہر لمحہ و ہر آن اگر تڑپ تھی تو رسول کی نصرت و خدمت کی، اس کی سچی آپ بیتی خود اسی کے ایک شعر میں سنیئے ؂

سب کھو کے تری راہ میں دولت دنیا
سمجھا کہ کچھ اس سے بھی سوا میرے لئے ہے!

بیشک اس نے دنیا نے، اور دولت دنیا ساری کی ساری کھو کے رکھ دی، اور کھوئی بھی کسی کی راہ ہی میں! "کھوتے" ہوئے اور "لٹتے" ہوئے سب نے دیکھا پاتے ہوئے اور ملتے ہوئے کی جھلک کسی کسی نے آج بھی دیکھ لی اور کل انشاء اللہ سب ہی دیکھیں گے۔

ذہانت، ناموری، شروع ہی سے حصہ میں آئی، علی گڑھ میں نام پیدا کیا، آکسفر جاکر ناموری کہاں سے کہاں پہونچی، "سول سروس" کی جانب لپکے الٹے پاؤں واپس کئے گئے بڑودہ اور رامپور دونوں کی قدرشناسیوں کا چند روزہ مزہ چکھا، بیوہ اور تہجد گزار ماں کی دعا نے جو غلاف کعبہ سے مانگی گئی تھی ——— کہ میرے شوکت اور محمد کو اسلام کا خادم بنا دے" ساتھ نہ چھوڑا، جو نہ صرف "مسٹر" تھا بلکہ مسٹروں کا سردار تھا۔ دیکھتے دیکھتے تو تھا چہرہ پر داڑھی، سر پر پٹے، جسم پر کھدر، حافظہ میں قرآن اور دل کے اندر اسلام کا سو ین کی تڑپ! ایک سوزش تھی کہ ہر وقت پھونک رہی تھی ایک جوشش تھی جو ہر آن خون کو کھولا رہی تھی! لڑکی ایک نہیں دو لڑکیاں، چھوٹی بچیاں نہیں، پالی پوسی شادی شدہ جوان لڑکیاں، عاشق زار باپ کی آغوش میں تڑپ تڑپ کر اور سسک سسک

کریں۔ قومی زندگی میں ہر طرف سے مخالفت، ہر منصوبہ ناکام، ہر سمت سے الزامات، قابلیت کا اعتراف سب کو، خلوص کا اقرار دشمنوں تک کو، لیکن ناکامی ہر طرف سے مسلط، کریکٹر کے بلند ترین معیار کا قائل ہر ایک شخص، لیکن دونوں پر چے ناقدری کی نذر، نظربندی کی سختیاں جھیلیں، جیل خانہ کی کڑیاں اٹھائیں اور آخر عمر میں اس سے بڑھ کر آزمائش کہ عمر بھر کے دوستوں رفیقوں اور عزیزوں سے بے تعلقی، آویزش، جنگ، مسلم لیگ سے جنگ، فرنگی محل سے جنگ، جمعیۃ العلماء سے جنگ، پنجابی ٹولی سے جنگ، بنگالی ٹولی سے جنگ، احرار سے جنگ، اہلحدیث سے جنگ، ہندوؤں اور انگریزوں سے جنگ مدت سے تھی ہی، اب اپنے مخلصوں، عزیزوں اور بھائیوں تک سے جنگ، تصدق شیروانی، خواجہ مجید، ڈاکٹر محمود اور انتہا یہ ہے کہ انصاری تک سے جنگ! غرض ایک خدا کے لئے ساری خدائی سے جنگ! دیکھنے والوں کو دیکھ دیکھ کر ترس آجاتا تھا لیکن جس کی نگاہ یہاں تک پہونچ چکی تھی کہ ؎

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہدے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے

اسے کوئی کیا سمجھاتا اور کیونکر روکتا! اللہ کا شیر، اللہ کے لئے سب سے لڑا اور خوب لڑا۔ شاعری کے عالم میں زبان سے جو کچھ نکلا تھا واقعات کی دنیا میں اس نے اسے سچ کر دکھایا۔ کہا کرتا تھا کہ اگر آج ساری دنیا مجھ سے روٹھی ہوئی ہے تو میں بھی ساری دنیا سے روٹھا ہوا ہوں۔

❊ ❊ ❊

احباب بار بار بگڑ بگڑ کر کہتے تھے کہ یہ شخص دیوانہ ہو گیا، خبطی ہو گیا کہ ساری دنیا کو اپنا دشمن بناتا چلا جارہا ہے، نہ مصلحت وقت پر نظر ہے نہ کسی کی دلشکنی کی پروا نہ اپنا نفع نقصان دیکھتا ہے، کوئی کہتا کہ آخر ساری دنیا کے اشارات چل رہے ہیں۔

کرتیڑ دبمدرد کو بھی آخر کار د باری اصول پر کیوں نہیں نکالا جاتا؟ کوئی صاحب فرماتے کہ کونسل اور اسمبلی میں جانے کے بجائے شور وغل میں پڑ کر محمد علی نے اپنی قوت و وقت کو ضائع کیا۔ ایک بزرگ کا ارشاد ہوتا کہ جامعہ ملیہ کی پرنسپلی پر جم جانا چاہئے تھا تاریخ پر پسیرا کے بعد کوئی محققانہ تصنیف کرنی تھی! اعتراضات صحیح تھے محمد علی واقعی دیوانہ ہو چکا تھا اسے جو کچھ دکھایا گیا تھا اس کے بعد بھی اگر دیوانہ نہ ہو جاتا...... تو اس کی دیوانگی میں کیا شبہ تھا۔؟

او سے دیوانہ کہ دیوانہ نہ شد
مرعسس را دیدو در خانہ نہ شد

کیسا وطن اور کہاں کی پرستی آج ہر طرف سے زور لگ رہا ہے کہ محمد علی کو نیشنلسٹ ثابت کر دکھایا جائے۔ وہ دیوانہ "عقل و فرزانگی سے بیگانہ دیوانگی کے اس مر تک پہونچ چکا تھا جہاں نہ "نیشنلزم" باقی رہ جاتی ہے نہ "کمیونزم" وہاں مدنظر صرف خا کی رضا تھی۔ کیا خدا کی شان ہے کہ جو اتنا اونچا ہو چکا کہ اسے نیشنلزم کی پستی پر زبردستی گھسیٹ کر لایا جارہا ہے اور جو مخلوق کو چھوڑ کر خالق کی پرستاری میں لگ چکا تھا اس کے لئے باعثِ فخر جایا جارہا ہے کہ وہ "وطن" اور "ہندوستان" کے محبت کا پجاری تھا! بیشک محمد علی بڑا سچا ہندوستانی تھا۔ اس کو اپنی ہندوستانی ہونے پر فخر تھا لیکن اس کی ہندوستانیت ماتحت تھی۔ اس کی اسلامیت کے! وہ خدا اور وطن دو کا قائل تھا قائل تھا خدا کا تھا اور چونکہ ہیانے وطن والوں کی خدمت بھی فرض رکھی ہے اس لئے وطن کا خادم بھی تھا۔

تمنائیں اور آرزوئیں بڑے بڑوں کی کرائی گئی اور جب وہ امیدیں ان پاکوں سے پوری نہیں ہوئی ہیں تو ناپاکوں نے ان پر حملے بھی خوب کئے ہیں۔ آج کی کوئی نئی بات نہیں رسنّت قدیم سے چلی آرہی ہے تالوا یا صالح قد کنت فینا مرجواً قبل ہذا اتنہانا ان نعا

- ایھیدا آباؤنا واستالمی نشک مما تدعونا الیہ مریب ۔

اور یہ دستور بھی شروع ہی سے قائم ہے کہ جس نے ذرا سا بھی دعویٰ محبت کیا، اس کا امتحان بھی ہو کر رہا۔ کسی کو سولی پر چڑھنا پڑا، کسی کو آرے سے چروا دیا گیا، کسی کو دہکتی آگ میں کودنا پڑا۔ کسی سے اولاد کی قربانی مانگی گئی، کسی کے خاک اور خون میں تڑپنے کا تماشا دیکھا گیا۔ کسی کو جلاوطنی نصیب ہوئی، کسی کا جسم کوڑوں سے لہولہان کر دیا گیا اور کسی کو قید خانہ کی بوجھل زنجیروں سے گراں بار کیا گیا۔ محمد علی کے لئے کیا یہ قانون بدل جاتا اور جس نے کہا تھا کہ

ہر رنگ میں راضی بہ رضا ہو تو مزا دیکھ
دُنیا ہی میں بیٹھے ہوئے جنّت کا مزا دیکھ

اسے لیلیٰ چھوڑ دیا جاتا؟ مجنوں کے ساتھ معاملہ جو کچھ بھی ہوتا ہو۔ مجنوں اور عاشقوں سوختہ جانوں اور دلفگاروں کے لئے تو یہی ایک قاعدہ مقرر ہے، ذلت و رسوائی، دیدہ پُرنم و خون، ناکامی و نامرادی، شکست و شکستِ نفس

عشق معشوقاں نہاں ست و ستیر
عشق عاشق با دو صد طبل و نفیر
عشق معشوقاں دو رخ افروختہ
عشق عاشق جان او را سوختہ

محمد علی تو جا اند خوشی خوشی جا جنت میں اپنی جگہ لے! تجھے آج کون مُردہ کہتا ہے غریب الوطنی کی موت بجائے خود ایک درجۂ شہادت رکھتی ہے اور پھر تیرے شہید و صدیق ہونے پر تو اللہ کا کلام شاہد ہے۔ والذین آمنوا باللہ ورسلہ اولائک ہم الصدیقون و الشہداء عند ربہم لہم اجرہم و نورہم ۔ تو اس وقت اپنے ماتم کرنے والوں سے کہیں زیادہ مسرت و آزادی کے ساتھ اپنا وہی روشن چہرہ لئے ہوئے عالمِ برزخ میں جنّت کی سیر کر

رہا ہے اور تیرے نیاز مندوں کو اپنی جگہ پر یقین ہے کہ بغیر اپنے دوستوں اور مخلصوں کے جم غفیر کو اپنے ہمراہ لئے ہوئے تو ہرگز جنت کے اندر قدم رکھنا پسند نہ کریگا اپنی ناسوتی زندگی میں تو نے اپنے چھوٹوں کو اپنے سے آگے رکھا جنت کی لطیف فضا میں تیرا یہ جوہر کہیں زیادہ روشن ہو کر چمکے گا اور جس طرح دنیا میں تو نے لاکھوں کرداروں کی رہنمائی کی جنت میں بھی انشاء اللہ بہتوں کی رہبری اور رہنمائی کا علم تیرے ہاتھ میں ہوگا۔ مدت ہوئی تو نے اپنے رفیق خاص غلام حسین مرحوم اسسٹنٹ ایڈیٹر کریڈ وائیڈ یٹر تیج اپیل کے ماتم میں چند شعر کہے تھے۔ وہی شعر آج خود تجھے سنانے کو جی چاہتا ہے۔

ابھی مرنا نہ تھا غلام حسین کوئی دن اور بھی جیئے ہوتے
کچھ تو انعام حق پرستی کے ہم غریبوں سے بھی لئے ہوتے
تم کو ایسا ہی تھا اگر جانا چند نعم البدل دیئے ہوتے
تھی شہادت کی کس قدر جلدی کام کچھ اور بھی کئے ہوتے
خوب کٹتا بہشت کا رستہ ساتھ ہم کو بھی گر لئے ہوتے

پ

بدنصیب قوم روتا اور ساری عمر روتی رہو آج تو بیوہ ہو گئی۔ تیرا والی وارث چل بسا۔ تیرا سہاگ لٹ گیا۔ صبر کر جس طرح غمزدہ رانڈیں اور سوگوار بیوائیں صبر کیا کرتی ہیں۔ بدبخت ملت آج تو یتیم ہو گئی۔ تیرے سر سے سایۂ پدری اٹھ گیا۔ شفقت پدری سے تو محروم ہو گئی۔ صبر کر جس طرح بے کس اور بے بس یتیم صبر کرتے ہیں۔ اللہ میں سب قدرت ہے ہر نیست کو ہست اور ہر ناممکن کو ممکن کر دکھا سکتا ہے۔ لیکن ہم گرفتار اسباب بندے اب کیا کہکر اپنے دل کو سمجھائیں اور کس چیز سے اپنے کو تسکین دیں۔؟

تو نظیری زفلک آمدہ بودی چو مسیح
باز پس رفتی وکس قدر تو نشناخت دریغ

محمد علی کی عمر ۵۳ سال کی ہوئی حضور انور نے اسی عمر میں مکے سے ہجرت فرمائی تھی. آقا کی
زندگی کا عکس وفادار غلام کی زندگی کے آئینہ میں خاصہ نظر آ رہا ہے قبل اس کے کہ
مخدوم کی مدنی زندگی کی فاتحانہ شان جھلکنے پائے. خادم کا رشتہ حیات ہی منقطع کر دیا
گیا. آج کی حسرتیں کون کہہ سکتا کہ کل کس کس طرح نکل کر نہ رہیں گی ؟

شوکت علیؒ

ایک دَور کا خاتمہ

نظر تصور کو ۲۵۔ ۲۶ سال پیچھے پھینکئے۔ مسلم یونی ورسٹی کی نئی نئی تحریک کا وہ غلغلہ بلند ہے کہ ہر صدا اس صدائے صور کے آگے دب کر رہ گئی ہے۔ کانسٹی ٹیوشن کمیٹی (مجلس ترتیب آئین و ضوابط) کا اجلاس لکھنؤ میں راجہ صاحب محمود آباد مرحوم کی زیر صدارت قیصر باغ میں ہو رہا ہے باہر کے تقریباً سارے مہمان محمود آباد ہاؤس کے عالیشان و پر تکلف مہمان خانہ میں مقیم ہیں ایک صاحب بہادر ایسے ہیں جن کی انگریزیت کی تسکین صرف انگریزی ہوٹل ہی میں ٹھہرنے سے ہو سکتی ہے اجلاس ہو رہا ہے کہ دوپہر کے وقت یہی "صاحب" جلسہ گاہ میں داخل ہوتے ہیں۔ لحیم و شحیم، گراں ڈیل، رنگ سرخ و سپید وضع و صورت بالکل انگریز، مونچھیں خوب گھنی اور خوب چڑھی ہوئی کہ آنکھوں سے گویا شعلے نکلتے ہوئے! ــــــ یہ آنے والا تھا شوکت علی ــــــ ۱۹۳۸ء کا مولانا شوکت علی نہیں ۱۹۱۱ء کا مسٹر شوکت علی، محکمہ افیون کا ایک اعلا افسر علی گڑھ کا مشہور کرکٹ کپتان اور مشہور تر فدائی۔ بہت چھٹ اولڈ بوائے۔ چندہ بازوں کا سردار بوڑھا نہیں، جوان شوکت علی ۔ اور بوڑھا وہ ۶۵ سال کے سن میں بھی کب ہوا تھا؟ دنیا کی عمر اور ڈیڑھ سال کھسکتی ہے۔ دسمبر ۱۹۱۲ء کی آخری تاریخیں ہیں ــ لکھنؤ میں وقت کی سب سے بڑی قومی مجلس محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس دھوم دھام سے ہو رہا ہے سہ پہر کے وقت کانفرنس کے مہمان عیسائیوں کے مشہور زنانہ کالج ازابلا تھوبرن کالج

صدق دسمبر ۱۹۳۸ء

پھر مدعو میدجاڑوں کی شام آتے ہی دیر کیا لگتی ہے۔ نماز مغرب کا وقت آجاتا ہے ابھی ابھی لمبی داڑھیاں رکھنے والے جبّہ وعمامہ والے جیسے بیٹھے میں ہیں کہ ایک سوٹ پوش نیچری، اٹھ کر وہیں مسیحی کالج کے برآمدوں اور کمروں میں نماز جماعت کے لئے اعلان کرتا ہے اور آکر ایک ایک مہمان سے خوشامد کرتا ہے کہ بھائی خدا کے لئے اس وقت نماز جماعت میں شریک ہو جاؤ، وضو نہیں ہے نہ سہی، اس وقت تو ہمیں عیسائیوں پر اپنی جماعت کا سکہ جمانا ہے۔ یہ وہی سوٹ پوش ہیٹ نواز شوکت علی تھی جس کا قالب اب بھی انگریز ہے، جنگ طرابلس و بلقان کے تجربہ کے بعد اب پوری طرح مسلم ہو چکا ہے —— فقہا ظاہر جو کچھ بھی فتوے دیں لیکن اپنے وہ ایک نماز بے وضو جو کتنی ہی باوضو نمازوں سے انشاءاللہ اللہ کے یہاں افضل نکلے گی!۔ خون کے چند قطرے بھی اگر کپڑوں میں لگ جائیں تو نماز درست نہ رہے گی۔ لیکن شہید کا سارا جسم اسی ناپاک خون سے ڈوبا ہوتا ہے اور حکم یہ ہے کہ اس کو پانی سے پاک نہ کرو اسی حالت میں اسے اللہ کے حضور میں پہونچا دو!۔

خون شہیداں را ز آب اولیٰ ترست

ایں خطا از صد صواب اولیٰ ترست

منظر بدلتا ہے اور ۱۹۱۳ء کے ۱۹۱۲ء میں نہ وہ صفاچٹ چہرہ رہتا ہے نہ چڑھی ہوئی مونچھیں اور نہ وہ زرق و برق انگریزی سوٹ! سر پر ہیٹ کی جگہ کلپاک جسم پر ڈھیلا ڈھالا ترکی وضع کا موٹے کپڑے کا لمبا سبز کوٹ، چہرہ پر گھنی داڑھی اور لبیں کتری ہوئی۔ اب شوکت علی اسٹیشن کلب کی جان نہیں، انگریزی سوسائٹی کا منظور نظر نہیں۔ وہ نہیں جس پر لیڈیوں کی نظریں پڑیں اور جس کی طرف "افسروں" کے "شیک ہینڈ" (مصافحہ) کے لئے بڑھیں۔ وہی شوکت علی جو طالب علمی کے زمانہ میں نیچے درجہ کے طلبہ سے ان کی اچکنیں اور غیر والیا اور کرتے اتروا کر سوٹ بوٹ میں ملبوس کراتا تھا۔ ان کے گلے میں ٹائیاں بندھوا تا تھا جسے مشرقیت سے گویا چڑھ تھی اور جو کہنا چاہئے کہ صاحبیت کا ضابطہ بہ تسمہ دیتا تھا۔

اب سرے پیر تک مشرقی تھا اور ٹھیٹھ مسلمان، وہی شوکت علی جو کبھی علی گڑھ کا پرستار تھا
اولڈ بوائز لاج کا فرمانروائے خود مختار، محض خادم کعبہ ہے خادم محض کعبہ یا رب کعبہ
نہیں کعبہ کے خادموں کا خادم کعبہ کے زائروں کا چاکر، سینہ پر مجلس خدام کعبہ کا نشان تمغا
جب دیکھئے حاجیوں اور زائروں کی خدمت میں سرگرم! ——— مولیٰ کی کریمی کے رنگ
بے حساب اور بندہ نوازی کے ڈھنگ کیسے بے شمار ہیں۔ بھاگے ہوؤں کو کس کس طرح
پکڑ کر گھیر گھار لاتے ہیں اور منہ موڑے ہوؤں کو کس کس طرح کمند میں ڈال کر کھینچ
بلاتے ہیں۔

* ——— * ——— *

اس کے بعد جتنے دور ہیں سب کی نظروں کے سامنے ہیں مقصود طول کلام نہیں۔
ہندوستان میں تحریک خلافت عبارت تھی انھیں دو بھائیوں علی برادران کی ذات سے
ہزاروں کے لئے جیل کی راہ آسان کر دی خود کانٹوں کا تاج بار بار پہنا کر دوسروں کے
کانٹے پھول بن جائیں برسوں ہندوستان کے طول و عرض میں شمال سے جنوب تک اور مشرق
سے مغرب تک گاندھی جی اور محمد علی کے ساتھ ل کر بے تاج کی بادشاہت کی مسلمانوں
تو مسلمان، ہندوؤں سکھوں، پارسیوں تک سے اپنا کلمہ پڑھوا یا۔ اور لاکھوں کی ہیں گر دنیں
کی زبان سے اللہ اکبر کے نعرے لگوا دیئے۔ اپنے مولیٰ کی بڑائی کہر وائی! اور پھر برسوں دنیا نے
بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا، خوب سہہ لیا بھگت لیا۔ اب بیگانے نہیں خود اپنے بیگانے بن
گئے۔ اور جنھیں کل تک ناز تھا مولانا کی رفاقت پر ———
خدمت گاری پر جو فخر و مباہات کے ساتھ آپس میں چرچا کرتے تھے کہ آج مولانا نے ہم
جو کی پر لوٹا ر کھوایا۔ ان ہی نے وہ زبان درازیاں شروع کیں کہ شرافت کی آنکھیں نیچی ہو گئیں
اور متانت نے منہ پھیر پھیر لیا۔ دنیا بھر کا کوئی گندہ سا گندہ الزام نہ تھا کہ جو گندی سی گندی
زبان سے اس پر نہ لگ چکا ہو۔ جو آج پھر کمال صبر اور انتہائی جمعیت کے ساتھ برداشت

ارا جارہا ہے ـــ محمد علی قلب نازک تر اور دماغ حساس تر رکھتا تھا کئی برس قبل ابتلا گاہ [illegible]
ے بھیا کو اپنے صبر وضبط کا زیادہ دعویٰ تھا۔ امتحان گاہ میں سات آٹھ سال اور رکھے گئے۔
دونوں بھائی دل میں خدا جانے کتنے الفاظ شمار وحساب سے خارج بول ڈالتے تھے۔ آخر بار
گناہوں کا کفارہ کیونکر ہوتا کارساز بندہ نواز نے کیا خوب انتظام کر دیا۔ ادھر دل وجگر
پر ہر روز نشتر وخنجر چلتے رہے ادھر سارے گناہ ایک ایک کر کے دھلتے رہے۔ قرب رضا کے درجے
ایک ایک کر کے بڑھتے رہے، یہ سمجھے کہ ہم مظلوم ہیں، غیب سے ندا آئی کہ مظلوم ہی یہاں مقبول ہیں۔

* ——— * ——— *

بزرگوں نے کہا ہے، کہ اللہ والا وہ ہے جسے دیکھ کر اللہ یاد پڑ جائے۔ شوکت مجذوب
کی خصوصیت یہ بھی کہ شکل دیکھتے ہی اللہ اکبر کی آواز کانوں میں گونجنے لگتی۔ اللہ کے نام کو
پکار پکار کر اتنی بار جپا، اللہ کے نام کی بڑائی اتنی بار خود پکاری، دوسروں سے پکروائی کہ خود
ہی اللہ اکبر کا ایک مجسمہ بن کر رہ گئے تھے۔ ادھر نمودار ہوئے نہیں کہ ادھر نعرۂ تکبیر لگنے لگے۔
ب کیا ذکر جہر کے سارے فضائل صرف خانقاہ نشینوں ہی کے حصہ میں آئیں گے۔ اور جس کے ذکر
سے عالم کا گوشہ گوشہ گونج اٹھا وہ محروم منہ دیکھتا رہ جائے گا۔!

کہاں کہاں ترا عاشق تجھے پکار آیا!

۱۹۲۴ء میں خلافت ہی نہیں ٹوٹی محمد علی کا دل بھی ٹوٹ گیا۔ اور برابر اور زیادہ ہی ٹوٹتا
گیا، شوکت کی موت خوب وقت کی منتظر رہی۔ ادھر وہ ہستی اپنے مولا کے حضور میں پہونچی
جس نے خلافت توڑی تھی اور ادھر وہ ذات بھی معاً طلب ہوئی جو خلافت ہی کے نام پر
جی رہی تھی۔ پیشی اب اسی آخری دربار میں ہو رہی ہوگی جس کے بعد کوئی دربار نہیں۔
اور فیصلہ اسی عدالت سے ہو رہا ہوگا جس کے اوپر کوئی عدالت نہیں۔ اجتہاد حق وصواب
جس کا تھا۔ انک میت وانہم میتون ثم انکم یوم القیٰمۃ عند ربکم تختصمون۔

* ——— * ——— *

کہتے ہیں کرکٹ کی شہرۂ آفاق کپتانی کے زمانے میں بیٹنگ ، بالکل بے تحاشہ بے تکان اور بے پناہ تھی۔ گیند بیٹے کو اس زور و قوت سے مارتے کہ گیند وہاں پہونچ کر گرتی جہاں کوئی فیلڈر تو کیا اس کا وہم و گمان بھی نہ پہونچ پاتا۔ ۲۰ سال کی عمر کی یہ خصوصیت ۶۴، ۶۵ سال کی عمر تک قائم رہی میدان کرکٹ کا نہیں سیاسیات کا سہی ـــــ جب وار کیا بے پناہ اور جب ہاتھ مارا تو اس زور و قوت کے ساتھ کہ ساتھی اور تماشائی دنگ اور حریف کے چہرے کا رنگ فق !

باؤنڈری اوور باؤنڈری ہٹ لگانے والے کپتان زندگی کی طرح موت کی بازی میں بھی جیت تیری ہی رہی جلوس زندگی میں سرا پا نکلے اور ایک سے بڑھ کر ایک پر شوکت۔ لیکن آہ ۲۸ نومبر کا جلوس میت ! کیا کسی دولہا کی بارات اس دھوم سے چلی ہوگی ! کیا کسی رئیس کی سواری اس شان سے نکلی ہوگی ! کیا کسی سیاسی لیڈر کو اتنے سوگوار نصیب ہوئے ہوں گے ! دیکھ لے شوکت علی کہ آج کتنی بیوائیں تیرے فراق میں بلک بلک کر رو رہی ہیں۔ کتنے بچے تیری یاد میں تڑپ رہے ہیں کتنے سفید ریش پیر مرد خود اپنے کو آج یتیم سمجھ رہے ہیں۔ کتنے جوانان صالح روتے پیٹتے تیرا جنازہ کاندھوں پر اٹھائے میلوں پیدل چل رہے ہیں ! ہزار ہا ہزار کے اس مجمع سے دور ملک کے گوشہ گوشہ میں، شہر میں، دیہات میں جہاں کہیں بھی ایک اللہ کے ماننے والے آباد ہیں، گھر گھر تیرا ماتم کس اخلاص و دردمندی کے ساتھ برپا ہے ! کروڑ دل کی آبادی کس درد دل کے ساتھ تیرا سوگ منا رہی ہے ! کتنے ایسے جنھوں نے کبھی تیری شکل نہیں دیکھی تھی آج اپنی جگہ محسوس کر رہے ہیں کہ گویا خاص انھیں کا گھر بے چراغ ہوگیا ہے !

شوکت کی موت تنہا ایک سپاہی کی موت نہیں، محض ایک جنرل کی موت نہیں، پوری ایک نسل کی موت، ایک مستقل دور کی خاتمہ ہے۔ شام ہونے لگتی ہے تو آفتاب کی حدت و تمازت پہلے دھیمی پڑتی ہے پھر آفتاب کے چہرہ پر زردی پھیلنے لگتی ہے یہاں تک کہ قرص آفتاب

آفتاب کچھ غائب ہو جاتی ہے جب دورِ تجدد و انقلاب کے پھیلنے کا وقت آیا تو کسی مشیت کا یہ متقاضی اُس کی ہوئی کہ تہذیب محمدی کے علمبردار اور اتحادِ اسلامی کے منادی ایک ایک کر کے اٹھا لئے جائیں پہلا بلاوا حکیم اجمل کا آیا پھر شاہ نادر غازی کی طلبی ہوئی اور پھر اقبال کی پکار ہوئی اور اب اس عمارت کے آخری ستون کو بھی ہٹا کر راستہ بالکل صاف کر دیا گیا۔ شوکت علی آخری مسافر تھے۔ اس قافلے کے، آخری یادگار تھے دعایت خلافت اور تحریک اتحاد عالم اسلام (صاحب کی اصطلاح میں پان اسلام ازم) آخری ستون کے گر جانے سے راستہ صاف ہو گیا وطن کی پوجا کے لئے سوشلزم اور کمیونزم کی ... کے لئے اور نئے نئے ناموں کے ساتھ طرح طرح کے آنے والے فتنوں کے لئے ۔ جیل جانے والے تختہ دار پر چڑھ جانے والے، اب بھی یقیناً پیدا ہوتے رہیں گے لیکن ملت اسلامیہ کے فروغ ... کے لئے، دین الٰہی کی نصرت کے لئے اپنا کاروبار مٹا دینے والا اپنی جاہ و مال دونوں کو پھونک کر دینے والا، اپنے سینہ کو گولیاں کھانے کے لئے پیش کر دینے والا اب کون اٹھے گا؟

وہ بات کہ بکن کی گئی کو بکن کے ساتھ

کلمۃ اللہ کے جہاد کو تاالگ رہا خود یہ تخیل قابل مضحکہ قرار پائے گا۔ اس پر آوازے کسے جائیں گے اس پر پھبتے لگائے جائیں گے۔ اور اس کا نام زبان سے نکالنا تعزیرات ملک میں سنگین جرم ٹھہرے گا۔

⁂ ——— ⁂ ——— ⁂

شوکت مرحوم زہد و تقویٰ کا پیکر نہ تھا اس راہ کا مسافر ہی نہ تھا مست و دیوانہ تھا۔ درویش قلندر نہ تھا لیکن دیوانہ اپنے اللہ کے نام کا۔ اور مست اپنے مولیٰ کے پیام کا۔ عمر بھر لڑتا ہی رہا آج اس سے جنگ کل اُس سے اور دشمنوں سے زیادہ خود دوستوں سے لڑا لیکن یہ ساری لڑائی بھڑائی یہ سارا شوقِ جنگجوئی، اُسی محبوب کی خاطر جو ہر قدرت والے سے بڑھ کر اور ہر توانا سے زیادہ توانا ہے۔ مدت ہوئی میر تقی میر کا ایک شعر مثنوی زہر عشق کی ... میں ایک صاحب کو پڑھتے سنا تھا ؎

دلِ پُرخوں کی اکِ گلابی سے عمر بھر ہم رہے شرابی سے

الحمدللہ کہ لیتے "شرابی" کا نمونہ دیکھنے میں آگیا۔ اللہ کے نام کا ایسا مست اور متوالا اب کیوں دیکھنے میں آئے گا! کس کا دل اُمتِ محمدیہ کی دردمندی میں اتنا خوناخون نکلے گا؟ اور موت کے بعد رُوح تو اُدھر اعلیٰ علیین کو سدھاری جسم کو جگہ کہاں ملی؟ یہاں حالی کا شعر مرثیہ غالب کا یاد کر لیجئے۔

کس کو لاتے ہیں بہر دفن کہ قبر
ہمہ تن چشم انتظار ہے آج

جامع مسجد دہلی کے سامنے کا میدان، پشت کی طرف لال قلعہ شاہان اسلام کی دنیوی عظمت و اجلال کی آخری یادگار، رُخ کی طرف مسجد کے در و دیوار گنبد و مینار اور شاہان اسلام کی دینداری کا نشان، سبحان اللہ وبحمدہٖ! اور پھر اپنے ہم مشرب سرمدِ مست کا جوار۔ اللہ اکبر! شوکت مرحوم ابھی زندگی میں اپنے مدفن کے لئے کوئی جگہ تجویز کرتے تو اس سے بہتر اور کون سی ہوتی؟

جا خوش نصیب اور ناموروں کو کیتر! فلاح امت و خدمت ملت کے میدان میں تیری یادگاریاں اور یادگاریاں قیامت تک زندہ رہیں گی اور تیری تربت پر وہ لوگ بھی عقیدت کے پھول چڑھاتے رہیں گے جو زندگی میں تجھے کچوکے ہی دیتے اور تیرے دل و جگر کو لہولہان ہی کرتے رہے۔ تیری تربت کے ذرہ ذرہ سے یہ صدا گوش دل سے سننے والوں کے کان میں آرہی ہے ؎

زمن بجرم تپیدن کنارہ کردی
بیا بہ خاک من و آرمیدنم بنگر!

"شہیدِ حق پرستی"

اک خونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی!

گاندھی جی رخصت ہوگئے۔ دنیا جنھیں مہاتما اور دیوتا سروپ اور خدا معلوم کن کن تعظیمی ناموں سے پکارتی تھی، اپنے ملک، اپنی قوم سے دم کے دم میں ہمیشہ کے لئے جدا ہوگئے۔ وہ کسی گورے کی سنگین سے نہیں کسی پاکستانی کی تلوار سے نہیں، ایک ہندوستانی ننگِ ہندوستان ہندوستانی ہی گولی کے ذریعے ہلاک ہوگئے! ——— ایسی موت کو موت نہیں شہادت کہتے ہیں۔ شہادت اصطلاحی نہیں، شہادت جو حق پرستی کی راہ میں مظلوموں کی حمایت و نصرت کی راہ میں، دادخواہوں کی فریادرسی کی راہ میں نصیب ہوتی ہے! ——— سفاک قاتل کی گولی اس مشتِ خاک کے جسم پر نہیں چلی، عین انسانیت کے سینے کو چھلنی کر گئی!

گاندھی جی عقیدۃً بھی نیم مسلمان ضرور تھے! توحید کے پوری طرح قائل و معترف، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ملک عرب ہی کا نہیں، ساری دنیا کا مصلح و معلّم تسلیم کرنے والے، آپ کے نام اور کام دونوں کی نہایت عزت کرنے والے، قرآن مجید کو ترجموں کی مدد سے بار بار اور کثرت اور شوق سے پڑھنے والے اور اپنے عمل کے لحاظ سے تو اس وقت ——— ہندوستان کی زندہ آبادی میں ہندوستان کے ۴، ۴½ کروڑ مسلمانوں کے سب سے بڑے پشت پناہ! ان کی اس شہادت سے ہندوستان پر جو شب

صدق ۵ فروری ۱۹۴۸ء

مجموعی جو کچھ گزرے گی، تو وہ ہے ہی، خود مسلمانوں کی، یہ کہنا چاہیے کہ وہ کمر توڑ گئے! مسلمانوں کو ان کی چھنی ہوئی اور لٹی ہوئی مسجدیں واپس دلا رہے تھے، ان کے اندر سے موحدوں کو وہ میٹھا رہے تھے: مسلمانوں کی جان، ایمان اور عزت، مال سب کی حفاظت وہ اپنا دھرم سمجھے ہوئے تھے۔ بے گھر مسلمانوں کو پھر سے وہ گھروں میں آباد کرا رہے تھے، ہزاروں لکھو کھا نیم جان مسلمانوں میں از سر نو جان وہی ڈال رہے تھے۔ جان انھیں مسلمانوں کی ہمدردی میں اور مسلمانوں ہی کی جانیں بچاتے ہوئے انھوں نے دیدی، اپنے کو قربان کر دیا، تاکہ مسلمان محفوظ رہیں!

÷ ~~~~~~ ÷ ~~~~~~ ÷

آج جب وہ اپنے خون بہتے ہوئے جسم اور فاقہ سے زار و نزار بدن کے ساتھ اپنے مالک و مولیٰ کے حضور میں حاضر ہوں گے، تو عجب نہیں کہ فرشتوں نے بہ ادب بارگاہِ قدس میں عرض کی ہو، کہ دل کے اندر کے عقائد کا حال تو حضور والا ہی جانیں، اتنی شہادت ہم ان کے ساتھ ناسوت کے بے شمار بندے بھی دے رہے ہیں کہ اس وقت آپ کی توحید کے پرستاروں اور آپ کے حبیبؐ کی امت کا سینہ سپر سب سے بڑھ چڑھ کر یہی بندہ تھا۔ اور جس جرم میں یہ قتل ہو کر آیا ہے، وہ بجز مسلم دوستی کے اور کچھ نہ تھا!

حسرتؔ موہانی[1]

حسرت موہانی بھی آخر اللہ کو پیارے ہوگئے اور یہ ایک سخت دھکا ہے جوارد و ادب اور
یت اسلامی دونوں کو بیک وقت پہونچا ہے
م اپنے وقت کے ایک بہترین شاعر تھے اور غزل گوئی کے تو کہنا چاہئے بادشاہ ہی تھے شوخی
ساختہ متانت کا اتنا دلآویز امتزاج کمتر ہی کسی کے حصہ میں آیا ہے۔ اپنے رنگ میں فرد فرید تھے۔
م عاشقانہ تھا شوخی بھی بے حیائی نہ تھی، رندی بھی اوباشی نہ تھی۔ معاملہ بندی بھی فحاشی نہ بھی
طفی بھی رکاکت نہ تھی۔ سنجیدگی بھی خشکی نہ تھی۔ ترکیبوں کی صناعت بندشوں کی لطافت۔
ب کی نزاکت کے لحاظ سے اپنی نظیر آپ جدت کی اجنبیت نہ تھی۔ ندرت تھی، طرفگی تھی۔
دہلی مومن و نسیم دہلوی کے رنگ کو پھر اپنا یا اُبھرا یا چمکا یا عشق جتنا یا تو بہت عام کے

---

[1] صدق ۱۳ ستمبر ۱۹۵۱ء

کے ساتھ اشرافِ پردہ نشین خاتون کے ساتھ آشنائی کا دم رقیبوں کے غول در غول بازاری بیسواؤں کے
ساتھ کبھی نہ بھرا۔ کلام پڑھیے تو دل میں سوز و گداز پیدا ہوگا، ولولے پیدا ہوں گے تمنائیں انگڑائیاں
لیں گی، جذبات نفسانی میں ہیجان ایک بار پیدا نہ ہوگا۔

محاورات پر عبور، زبان پہ حکمرانی بلکہ صاحبقرانی کر رہا ہے، وہ شاید شعر جتنا اچھا کہتے تھے
ہی اچھا پرکھتے بھی تھے۔ سخنگوئی اور شئے ہے اور سخن فہمی اور، یہاں جو پایہ سخنوری میں تھا
سخن سنجی میں! ۔۔۔ یاراں دادِ دواں نیز ہم۔ اردو کے معلی کے پرچوں کو پڑھ پڑھ کر خدا معلوم کتنوں
کو خود دعویٰ نقادی ہوگیا۔ آخر زمانہ میں ادھر کئی سال سے سیاست شاعری پر غالب آگئی تھی
پھر بھی سالہا سال کی مشاقی و اُستادی پر کوئی پانی کیسے پھیر دے!

سیاست میں وہ خود اپنی ذات سے خود ایک انجمن ایک ادارہ ایک پارٹی تھے
شروع میں اپنے کو منسوب تلک کے اسکول سے کرتے رہے اور اب ایک عرصہ سے اپنے کو کمیونسٹ
کہنے لگے تھے لیکن حقیقۃً وہ مقلد کسی کے بھی نہ تھے۔ مجتہد اگر نہیں تو منفرد تو ضرور رہے۔ کانگریس
میں جب تک رہے ساتھیوں سے لڑتے جھگڑتے اور آزادی کامل کا علم بلند کئے رہے۔ تحریک
خلافت میں رہے تو اسی شیر دلی کے ساتھ اور مسلم لیگ میں جب کام کیا تو حد یہ ہے کہ قائد اعظم
جناح صاحب تک کی شخصیت سے بھی نہ دبے۔ مذہبی اتنے کہ کسی میٹنگ کسی جلسہ میں بھی
ادھر نماز کا وقت آیا اور ادھر وہ اپنی میلی کچیلی ہی شیروانی اتارا اور اسی کو جانماز بنا، کمرہ
برآمدہ میں جہاں بھی جگہ ملی نماز کے لئے کھڑے ہوگئے۔ حج زندگی میں ایک دو نہیں شاید کئے
سلسلہ قادریہ میں فرنگی محل کے خاندان رزاقیہ میں تھے اور خوش عقیدگی میں حد غلو تک پہنچے
ہوئے تھے۔

ردولی بانسہ اور لکھنؤ کے عرس تو شاید ہی کبھی ناغہ ہونے پاتے اتنی گنجائش داغ
اور مذہب کے ساتھ شیفتگی دنیا کے کسی کمیونسٹ میں پائی گئی ہے؟

سیاسی نادبی اور سارے پبلک پہلوؤں سے بڑھ چڑھ کر دلکش تر تاثر قابل عظمت

مولانا کے ماہانہ رسالہ کا نام (مرتب)

تو وہ صفات، خود حسرت کی شخصیت اور ذات تھی۔ سادگی، بے تکلفی، تواضع، انکسار کی
تصویر تھے اپنی بڑائی کا احساس تک نہ تھا ان کی کیونزم بھی درویشی کے مرادف تھی۔ گھر میں
دغیرہ کا ذخیرہ سال بھر کے لئے کیا معنی مہینہ بھر یا چند روز کے لئے بھی جمع کرنا ناجائز سمجھتے تھے
روز کا روز سودا اپنے ہاتھ سے لاتے تھے۔ جب دیکھئے دامن میں لئے بازار سے چلے آرہے ہیں۔
سی سے تکلف نہ کوئی شرم اور جھجک۔ راستے میں بڑے بڑے موٹر نشین مل گئے بے دھڑک
ے کھڑے باتیں کر رہے ہیں۔ میلی شیروانی، میلی ٹوپی، بوسیدہ عینک کے ساتھ راجہ سلیم پور
ہاں چلے گئے۔ فلاں راجہ، فلاں نواب، فلاں گورنر کے ہاں چلے گئے اور جو کچھ کہنا تھا، لگی
لپٹی رکھے بغیر کہہ سن آئے۔ کوئی مہمان آگیا تو کچھ پروا نہیں رات کی باسی کھچڑی چھنکے پر لٹکی
ہوئی دہی لے کر خود بھی کھائی اس کو بھی کھلا دی بڑا تکلف کا اہتمام کیا تو جاکر دو پیسہ کا دہی
لے آئے۔ ہر حال میں مست ۔۔۔۔۔۔۔۔ اور مگن اتنے لیڈروں میں انھیں کو دیکھا بے صبری
اور ناشکری کا لفظ جیسے ان کے کان میں کبھی پڑا ہی نہ تھا۔ جو کچھ بھی مل گیا ہنسی خوشی کھا
لیا اور کچھ نہ ملا تو فاقہ بھی اسی خوشی دلی اور بشاشت قلب کے ساتھ کاٹ دیا۔ نفس مطمئنہ
کتابوں میں پڑھا تھا کہ بعض بزرگوں کو حاصل ہو جاتا ہے آنکھوں سے مثال اسی درویش
زندگی میں دیکھی۔

آج وہ اٹھ گیا۔

۱۔ جو اُردو ادب و انشاء میں ایک ممتاز ترین مقام رکھتا تھا جس کا اس میدان میں کوئی ہمسر و شریک نہ تھا اور وہ جس نے اپنا کوئی جانشین نہیں چھوڑا۔

۲۔ جو اُردو زبان کا ایک بہترین مقرر و خطیب تھا۔

۳۔ جو مدتوں دین و قرآن کی خدمت بھی اپنی بصیرت اور ادراک کے مطابق کرتا رہا۔

۴۔ جو ملکی سیاسیات کی صف اوّل میں ۳۰، ۳۵ سال سے رہا کیا۔

۵۔ جس نے اُردو صحافت میں ایک بالکل نیا اور شاندار باب کھول دیا۔

۶۔ جو عظیم الشان تحریک خلافت کے اکابر کی کہنا چاہیے اب آخری یادگار رہ گیا تھا

۷۔ جو اب ایک پیکر شرافت بن گیا تھا اور ۱۹۴۷ء کے بعد سے خدا معلوم کتنے... بے سہاروں کا سہارا بنا رہا...!

اللہ بال بال مغفرت فرمائے...!

اللہم اغفرلہ وارحمہ

از صدق جدید ۲۸ فروری ۱۹۵۸ء

جواہر لال نہرو

۱۸۸۹ء تا ۱۹۶۴ء

پنڈت جی کے مذہبی عقیدوں سے یہاں بحث نہیں اُن کی لادینی آشکارا تھی۔ یہاں ذکر اُن کی بلند کرداری اور شرافت نفس کا کرنا ہے۔ وہ ایک شریف و کریم باپ کے بڑے شریف و کریم فرزند تھے تعلیم اعلیٰ سے اعلیٰ پائی۔ پرورش بڑی ہی خوشحالی اور انتہائی ناز و نعمت کے ماحول میں ہوئی۔ آزادیاں ہر قسم کی۔ کیا ہندوستان اور کیا انگلستان میں تمیز میں بےفکری سے جس طرح چاہے خوب پیتے پلاتے یار آشناؤں کے ساتھ گلچھرے اڑاتے ہر طرح داد عیش دیتے۔ یہ کچھ ہوا شروع ہی سے زندگی پاکیزہ، سنجیدہ، شریفانہ رہی اور طرفہ تر یہ ہی حالی رہا پڑھنے لکھنے میں بڑی علمی بلندیوں کے شیدا ملک کی آزادی اور وطن کی خدمت ہی کو شروع ہی سے اپنا مقصود زندگی بنالیا، اور اس لگن کو آخر تک نباہ دیا۔ نہ دنیا کا لالچ کیا نہ مال و جاہ کی محبت کو سینے میں جگہ دی۔ نہ اپنے کو بڑا مانا نہ کسی پر اپنا تفوق جتایا۔ خدمت لینے کی نہیں خدمت کرنے کی دھن سوار رہی۔ دنیا نے خادم کی جگہ انھیں مخدوم بنا دیا اور اپنے سر اور آنکھوں پر جگہ دینا شروع کردی۔ جوانی میں بڑی سختیاں جھیلیں۔ خدا معلوم جیل ہی میں کتنی مدت کاٹی۔ دوستوں کی بے وفائی طوطا چشمی غداری کے شکار آخر تک رہے۔ انھوں ہی کے تیر پر تیر کھاتے رہے صحت جو آخر میں اتنی گر گئی تھی اس میں سن شیخوخت سے کہیں زیادہ دخل ان مسلسل دل شکنیوں اور شدید مایوسیوں کو تھا۔

مسلمانوں نے ہمیشہ خوب ہی پوشاک کھانے پینے، بول چال، عام طرز معاشرت و تمدن

صدق جدید جون ۱۹۶۴ء

میں دوسرے کشمیری پنڈتوں کی طرح مسلمانوں کی تہذیب تمدن کو بالکل اپنائے ہوئے تھے اور اپنے والد پنڈت موتی لال کے قدم بہ قدم تھے۔ رفیقوں، دوستوں مخلصوں میں بڑی تعداد مسلمانوں کی تھی، مولانا محمد علی، مولانا ابوالکلام، ڈاکٹر سید محمود، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، عبدالمجید خواجہ، چودھری خلیق الزماں، تصدق احمد خاں شیروانی سے گہرے تعلقات تھے اور رفیع احمد قدوائی تو جیسے اُن کے عزیز قریب ہی تھے۔ خدا جانے کتنے نوجوان مسلمانوں کو اپنے خرچ سے پڑھوایا، ملازمتیں دلوائیں، روزگار سے لگایا اور کتنے سن رسیدہ مسلمانوں کو اپنے پاس سے مالی امداد کی۔ جو ان کا کوئی بھی ساتھی اقتدار ہاتھ میں آنے کے بعد بدل گیا تو اس کی آؤ بھگت اسی پرانے طریقہ پر کی، یہ پتہ بھی نہ چلنے دیا کہ وہ اس وقت وزیر اعظم ہند سے مل رہا ہے۔۔ غریبوں، ضعیفوں، مصیبت زدوں کی امداد میں ملکہ خاص حاصل تھا۔ غرض جوہر انسانیت کا ایک نمونہ تھے اور ایک ہی وقت میں مدبر بھی مفکر بھی صاحب علم بھی پرانی اردو میں ایک لفظ "وضعداری" آتا ہے وہ گویا ان پر ختم تھی۔ عام مسلمانوں کے لئے اب بھی ایک بڑا سہارا بنے ہوئے تھے۔ اُن کے دُکھ درد میں شریک ــــــ مزاج میں تواضع و فروتنی اتنی کہ ۱۹۲۵ء تھا جب میں نے مولانا محمد علی سے پوچھا کہ گاندھی جی کا جانشین آپ کے خیال میں کون ہو سکتا ہے؟ تو انھوں نے جھٹ سے جواہر لال نہرو کا نام اور صرف انھیں کا لیا اور ساتھ ہی یہ کہا کہ اُن میں اگر کمی ہے تو بس یہ کہ وہ اپنے کو پیچھے ہی بہت رکھتے ہیں۔ مولانا ہی نے اپنے صدارت کے زمانہ کانگریس ۱۹۲۳ء میں انھیں کو کانگریس کا جنرل سکریٹری بنایا اور اور طریقوں سے بھی آگے بڑھایا۔

ــــــ ✣ ــــــ ✣ ــــــ ✣

ہندوستان کی ۳۶ کروڑ مخلوق کے تو گویا سیاہ و سپید کے مالک تھے ہی۔ بر اعظم ایشیا بلکہ کہنا چاہیے کہ روئے زمین پر اقتدار کے حصہ دار تھے۔ مرجع خلائق اور نامورانِ عالم کے مرکز بنے ہوئے تھے۔ جب وقت موعود آیا۔ تو آنے میں چند گھنٹے بھی مشکل ہی سے لگے، ابھی

کو [illegible] ٹ پر اچانک بیماری کی پہلی علامتیں معلوم ہوئیں اور ماہرین فن ڈاکٹر ٹیلیفون پر [illegible] ے اور ہر ممکن انسانی تدبیر دوا علاج کی شروع ہوگئی کچھ ہی دیر بعد بیدار مغز [illegible] ذہانت وفطانت مریض بیہوش تھا۔ ڈاکٹر پر ڈاکٹر جمع ہوتے گئے، مریض کی حالت بگڑتی چلی گئی۔ ۱۱ بجے حالت اور بگڑی۔ آکسیجن پہلے سے دیا جارہا تھا۔ بلڈ پریشر گرنے لگا۔ اور ۱ بجے نبضیں ڈوبنے لگیں اور ڈاکٹروں نے جواب دیدیا ـــــــ اٹل تقدیر کے آگے عقل سائنس تدبیر کی متحدہ ترقی یافتہ کوششوں کی شکست کا ایک اور اعلان ہے۔ یہاں تک کہ دوپہر کے ۲ بجتے ہی مملکت ہند کا آفتاب اپنی ساری خیرہ کن تابانیوں کے ساتھ غروب ہوکر رہا۔ موت جس طرح دنیا کے حقیر ترین گدائے بے نوا کو آتی ہے اسی قطعیت اور اسی برق رفتاری سے وقت کی ایک مقتدر ترین ہستی کو آگری! ماہرین فن کی پوری ٹیم [illegible] ل کرمنٹ دو منٹ کے لئے ہوش ہی میں لے آنے میں ناکام رہی! ـــــــ

راجہ علی محمّد خاںؒ

محمد علی کے بعد علی محمد! سنہ عیسوی کا آغاز تھا کہ ملت نے محمد علی کا داغ سینہ پر کھایا
سنہ ہجری شروع ہوا تو علی محمد خاں نے سفرِ آخرت اختیار فرمایا۔ قوم کا خادم جب رخصت
ہوا اور وطن کا مخدوم اب۔

آج وہ کل ہماری باری ہے!

آج مہاراجہ کی باری آئی کل مہاراجا کی باری تھی یشب برات میں ایک طلبی ہوئی۔
محرم میں دوسری کی منادی سننی پڑی۔ غربا کا جگر، کل پھٹ چکا تھا، امراء کا آج
ٹوٹ رہا! کن کن حسرتوں پہ روئیے اور دل کو کیا کہہ کر سمجھائیے! خاص و عام امیر و
غریب راجہ اور پرجا، سب کے سب اب حسرت و یاس کی تصویر، مجبوروں سے بڑھ کر مجبور
اور یتیموں سے بڑھ کر یتیم انسان ضعیف البنیان! کائنات کے ذرہ ذرہ کی حرکت کی اپنی

صدق ۱۹۳۱ء

...نی کے تابع دیکھنے کا آرزومند؛ اس کی آرزوؤں اور تمناؤں کی آج تک کبھی پروا کی گئی ہے!
جس حکمت کاملہ نے عالم کے سرود کردار کو مخاطب کرکے ایک میت وا ہم ہیتوں کی منادی کردی
اس کی مشیت کے آگے ظاہر ہے محمد علی کی ہستی اور علی محمد کی بساط ہی کیا ہو سکتی تھی؟ جو
بھیجے گئے تھے وہ واپس بلا لئے گئے اور جس نے بھیجا تھا، وہ اسی آن اور اسی شان! اسی
...ما در اسی جلال؛ اسی تزک اور اسی احتشام اسی دارائی اور اسی کبریائی، اسی جمال
اسی دلبرائی، اسی ناز اور اسی محبوبی، اسی حسن اور اسی زیبائی کے ساتھ، جوں کا توں،
...م حی و قیوم۔!

مٹ گیا نقش احمد و محمود
رہ گیا، لا الٰہ الا اللہ!

کہتے ہیں، کہ راجہ ڈرپانے نیازمندوں کی زبان بجائے لفظ "مہاراجہ" کے راجہ ہی کی
...دی تھی؛ علی محمد خاں شیعہ تھے ہوں گے، زبانوں پر چرچا ہے کہ بڑے نشیلست تھے، یہ بھی
...ہوگا لیکن ہم جن راجہ صاحب محمود آباد سے واقف تھا وہ مسلمان ہی تھے اور بڑے
...مان اوّل بھی مسلمان اور آخر بھی مسلمان؛ محمد علی کی سی تڑپ اور تپش نہ سہی، پھر بھی زبان
...کا کلمہ دل میں اسلام کا درد اور دماغ میں مسلمانوں کی خیراندیشی دسترخوان کی وسعت
...مان کے استقبال کو موجود خزانہ کی تھیلیاں ہر کلمہ گو کے لئے کھلی ہوئی دولت کی تمنا
تو مسلمانوں پر زر پاشی کے لئے اعزاز کی طلب تھی تو مسلمانوں کی نفع رسانی کی غرض سے
فیض کا چشمہ تھا قوم کی سیرابی کے لئے ایک کرم کا دریا تھا افراد قوم کی آبیاری کو
جود و عطا کا بادل تھا جو امنڈ امنڈ کر برسا اور اس طرح برسا کہ اپنے رقبہ حدود
تشنہ لب نہ قوم کو چھوڑا، نہ افراد قوم کو! اس کا در حاجتمندوں کا مرجع، اس کی ڈیوڑھی
...دوں کی امیدگاہ؛ کم نصیب تھا وہ جو اس کے یہاں سے مایوس اور رائس۔ کے

پاس سے محروم واپس ہوا۔

صوبہ کا ایک شریف سنّی مسلمان حج کے لئے روانہ ہوتا ہے اور رخصتی ملاقات کے وقت اپنے لڑکے کا ہاتھ اسی شیعہ رئیس کے ہاتھ میں دے جاتا ہے حاجی کو حج مبرور نصیب ہوتا ہے اور استراحت دائمی کے لئے حرم پاک کی سرزمین یتیم لڑکا کالج میں زیر تعلیم ہے اور ختم تعلیم میں ایک سال کی مدت باقی. دریا دل شیعہ رئیس کو اطلاع ہوتی ہے اور بارہ مہینے کے بجائے سولہ مہینے کے لئے پچاس روپیہ ماہوار کے حساب سے پورے آٹھ سو کی رقم بینک میں اس کے نام سے جمع ہو جاتی ہے ــــ لکھنؤ کے ایک نہایت شریف دستار دستی گھرانے کی ایک مسکین بیوہ کی جوان لڑکی بیاہنے کو بیٹھی ہے سامان غریبانہ حیثیت کا بھی میسر نہیں شیعہ رئیس کو خبر ہوتی ہے اور دوسری صبح ایک معتمد خاص کے ہاتھ ایک پورا اسکیرہ چپ چپاتے اسی بیوہ کے ہاتھ میں پہونچ جاتا ہے۔ یں جس محمود آباد کے غم میں افسردہ تم ملول ہوں وہ یہ تھا! اس کی فیاضیوں کے بے شمار واقعات میں سے دو میں نے نمونہ کے طور پر یاد دلائے گئے. وہ قومی لیڈر اور نیشنلسٹ پارٹی کے افسر، مسلم لیگ کے صدر اور مسلم یونی ورسٹی کے وائس چانسلر، لکھنؤ یونی ورسٹی کا ساعی اور اودھ چیف کورٹ کا بانی انگلش کا دوست اور مسٹن کا دشمن، آئی. ڈی. ٹی. کا مالک اور ہمدم کا پیدا کرنے والا حکومت کا ہوم ممبر اور سرکار برطانیہ کا منظور نظر نہیں وہ ایک مسکین نواز یتیم پرور اشرف الغربا کا سرپرست اور حاجتمندوں کا حاجت روا نئے وارثوں کا وارث، غریبوں کا دستگیر جوان نواز دستگیر، درماندوں کا شفیع اور بیواؤں کا کفیل علی محمد خاں تھا اس کے بڑے بڑے شاہانہ چرچے اور لکھوکھا لاکھ کی قومی فیاضیاں سب نے دیکھیں اس کی چھپی ہوئی خیرات اور پوشیدہ زرپاشیوں کی خبر مخلوق میں کس کو؟

دنیا اور اس کی جگہ گا بت ختم ہو چکی۔ نیشنلزم اور کمیونزم کے مناقشے تمام ہو چکے۔ بندہ اپنے
مالک کے پاس پہونچ چکا۔ راجہ پرجا بن کر حقیقی مہاراجہ اور اصلی شہنشاہ کے حضور میں حاضر ہو
گیا۔ نوحے لکھے جا رہے ہیں، ریزولیوشن پاس ہو رہے ہیں، تقریروں میں قوتِ خطابت کے
کمالات دکھائے جا رہے ہیں اور شعراء نامدار مضمون آفرینیوں کے جوہر دکھا رہے ہیں۔
خوب ہے تو دنیا ان طلسم آرائیوں کو چھوڑ کر آیئے ہم اور آپ مل کر سیکڑوں اور ہزاروں محتاجوں
مزدوروں، دردمندوں، یتیموں اور بیواؤں، مسکینوں اور معذوروں کے ہم آہنگ ہو کر مرنے والے
کے حق میں دعاءِ مغفرت اُس رب الارباب کے حضور میں پیش کریں جس نے اپنی رضا ناتوانوں
اور کمزوروں، بیکسوں اور دل شکستوں کی رضا میں مخفی کر رکھی ہے۔ آج نہ راجگی باقی ہے نہ
مہاراجگی، نہ ہٹلر کی دوستی کام آ رہی ہے نہ حکومت کی ہوم ممبری نہ کے۔ سی۔ ایس۔ آئی کا
خطاب پوچھا جا رہا ہے نہ انجمن تعلق داران اودھ کی صدارت! نہ کوئی مصاحب، رفیق ہے
نہ کوئی مشیر، ہاں! آج قدر ہو رہی ہے تو اُن بھوکوں کو کھانا کھلانے کی جو دانہ دانہ کو ترس
رہے تھے، اُن ننگوں کو کپڑے پہنانے کی جو ایک دھجی اور ایک ایک چیتھڑے کے لئے آسرا لگائے
تک رہے تھے جو مخلوق کی نظر میں حقیر اور بے جا رہے تھے، وہ خالق کے دربار
میں رفعت والے نکلے، جنھیں کچہریوں کے پیادوں اور کوٹھیوں کے دربانوں نے دھکے دیکر
نکالا تھا! انھیں ہاتھوں ہاتھ لینے کے لئے ملائکہ کی صفیں آگے بڑھیں، جس نے دنیا میں
ان ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑا تھا! ان ٹھکرائے ہوئے سروں پر اپنا ہاتھ پھیرا تھا! اُس کی
بشری کمزوریوں اور لغزشوں کا شمار کچھ بھی نہیں! کیا اس مولا کے دربار میں جو کریموں کا
کریم، اُس کے ساتھ بجز لطف و رحمت، بجز عفو و مغفرت کے کسی اور معاملہ کی بھی توقع
ہو سکتی ہے؟ جا! اے سنگدل رئیسوں، اے اُمتِ مرحومہ کے غمخوار، غمگسار! اپنے رب اور
مولا کے حضور میں خوشی خوشی جا! خائف و متردد نہ ہو کہ آج تیری حمایت اور پشت پناہی
کو یتیموں کی فوج کی فوج، بیواؤں کی قطاروں کی قطاریں اور بیکسوں کی صفیں کی صفیں موجود

رفیع احمد قدوائی مرحومؒ

آنریبل رفیع احمد قدوائی وزیر خوراک مملکت ہند کی وفات پر تعزیت کی جائے کس سے
کی جائے؟ کون ہے جو دل سے ان کا سوگوار نہیں؟ کون ہے جس کی وہ بالواسطہ ہی کا
نہ کوئی خدمت نہیں کر گئے؟ ۔۔۔ ۱۸۹۴ء میں مسولی ضلع بارہ بنکی کی خاک سے اٹھے ۱۹۵۴ء
میں ناسوتی زندگی کے ۶۰ سال گزار کر اسی خاک میں چھپے۔ خدمت خلق کو بطور مقصد حیات
یا مشن کے اختیار کر کے ایک عالم میں اپنا نام کر گئے۔

قدوائی خاندان اودھ کا ایک مشہور خاندان ہے ہر علم و فن ہر شعبۂ زندگی میں آج سے
نہیں کئی صدیوں سے ممتاز۔ خود رفیع مرحوم کے حقیقی چچا جوان مرگ ولایت علی بمبوق، متوفی
۱۹۱۹ء انگریزی کے ایک بہترین انشا پرداز اور مولانا محمد علیؒ کے مخلص خصوصی
حال ہی میں گزر چکے ہیں۔ رفیع مرحوم بعض حیثیتوں سے ان سب سے بازی لے گئے۔

علی گڑھ میں تعلیم پائی، تربیت خصوصاً سیاسی تربیت موتی لال نہرو کے سایۂ عاطفت
اور جواہر لال نہرو کی رفاقت میں ملی۔ نظم و تنظیم کی بے مثل صلاحیت فطری تھی۔ علی گڑھ
میں اس کی نشو و نما ہوئی اور دولت علی گڑھ سے لیا۔ سیاسی سوجھ بوجھ کے لئے آنند بھون
کے در و دیوار کافی تھے۔ اپنے کو پیچھے ہی رکھنا جانتے تھے۔ اپنے کو آگے بڑھانے کے فن
سے ناواقف تھے مگر بڑھائے گئے کھینچ کر اور ڈھکیل کر آگے بڑھائے گئے کونسل کے ممبر ہوئے
پھر اپنے صوبہ میں پہلے ریونیو اور پھر ہوم منسٹر ہوئے لیکن ان کی ہوم منسٹری کے عدل و
قسط دادرسی اور حق کوشی کو ہندوؤں کی متعصب پارٹی برداشت نہ کر سکی، ہٹائے گئے۔

صدق جدید ۱۴؍ نومبر ۱۹۵۴ء

ہٹ کر اور اونچے ہوئے صوبائی وزیر کے بجائے حکومت ہند کے وزیر ہوئے محکمہ ڈاک و تار کا اور اُس میں نام پیدا کر کے رہے پھر دشوار ترین محکمۂ غذا میں منتقل ہو گئے سالہا سال کی گرانی کو انھیں نے مٹایا، راشن کو انھوں نے توڑا، اور جس محکمہ کو سنبھالنے میں ڈاکٹر راجندر پرشاد جیرام داس دولت رام اور گورنر کے ایم منشی جیسے خواص تک سب عاجز و ناکام رہ چکے تھے اس میں کامیابی نے قدم انھیں کے چومے اور جو بدنامی یقینی سمجھی جاتی تھی اس کے بدلے نیک نامی کا تاج انھیں کے سر کو نصیب ہوا۔

کہتے کم تھے کرتے زیادہ تھے کتابوں کا مطالعہ برائے نام سا تھا، بمصداق فی الحقیقت "خود تو ام الکتاب کے تھے" اپنی فطری ذہانت، ہوشمندی، فہم سلیم کی مدد سے باتیں اپنے دماغ سے نکال لیتے تھے تقلید جامد کے قائل نہ تھے۔ تقریر کے شوقین اور لفّاظ باز نہ تھے ضرورت کے وقت تقریر کرتے وہ بھی مختصر اور حشو و زوائد اور خطابیات سے پاک سراپا عمل تھے اور ہر وقت عملی سرگرمی میں منہمک اس کے باوجود خشک یا عبوس ذرا سا بھی نہ تھے ہر وقت خوش رہتے اور دوسروں کو خوش رکھنے کی کوشش میں لگے رہتے بہت سویرے اٹھتے اور اسی وقت سے ان کا کام کاج شروع ہو جاتا۔ دنوں کے کام گھنٹوں اور گھنٹوں کے کام منٹوں میں چکا دیتے کھڑے ہو کر اور ٹہلتے ہوئے یا لیٹے ہوئے بہر حال و وضع میں کام ہی کرتے ہوئے پائے جاتے تھے۔ غالباً جانتے ہی نہ تھے کہ کوئی چیز بے شغلی بھی ہوتی ہے ہندو سیاسی کارکنوں، مدبروں، اہل سیاست کے مقابلہ میں ان کے درمیان میں گھرے رہ کر اپنے حسن عمل و قابلیت، حسنِ انتظام، کارگزاری، تدبر اور تدین سے مسلمانوں کا بول بالا کر دیا۔ تنہا یہی ایک خدمت قدوائی مرحوم کو امتیازا ور ۔۔۔ بڑے امتیاز کے مقام پر کھڑا کر دینے کو کافی ہے۔

دشمنوں سے اس طرح ملتے کہ جیسے دوستوں سے ملا جاتا ہے۔ دوستوں سے یوں برتاؤ کرتے کہ جیسے عزیزوں قریبوں سے کیا جاتا ہے۔ اور عزیزوں اور قریبوں کو اپنے

نفس کی طرح عزیز رکھتے بلکہ شاید اس سے بھی مقدم اور یہ دوست دشمن اپنے اور غیر کی تمیز بھی کیسی، کوئی ان سے کام نکالنا چاہے یا کسی کو ان سے کوئی ضرورت آ پڑے تو انھیں یاد نہیں رہتا تھا کہ کون اپنا ہے اور بے گانہ کون۔ مقصود انھیں صرف کام کردینا ہوتا تھا اور اس وقت ہر ایک ان کا "اپنا" ہوتا تھا بے گانہ کوئی بھی نہ رہتا ــــ خلق اللہ کی خدمت وہ عبادت کی طرح کرتے تھے اور خدمت کرنے میں انھیں وہی مزا آتا تھا جو دوسروں کو خدمت لینے میں آتا ہے!

جوانی آزادانہ گزری لیکن عمر کے کسی دور میں مئے و نوش کے قریب گئے نہ اوران شغلوں میں پڑے جو لازمۂ شباب سمجھ لیے گئے۔ مشرقی اخلاق و ادب کی لوری پابندی کے ساتھ شباب اور شیب کی ہر منزل گزار دی۔ شادی خاندان ہی میں ہوئی اور بیوی نیک دل دین دار عبادت گزار ملیں۔ نہ انھیں کبھی پردے سے باہر نکالا نہ انھیں کسی طرح آزاد محفلوں میں شریک کیا۔ بلکہ ان کی دینداری میں ہر طرح معین ہی رہے پچھلے سال انھیں حج بھی کرادیا ــــ جس اونچے حلقے میں وہ تھے وہاں اس کی مثال ڈھونڈے سے بھی نہ ملے گی۔

زندگی تمام تر سادہ ہی رہی وہی موٹے کپڑے کی معمولی شیروانی اور پائجامہ، سوٹ، ہیٹ کو کبھی ہاتھ ہی نہیں لگایا۔ کپڑے کسی اونچے ٹیلر ماسٹر کی دوکان سے نہیں گھر ہی میں سلوائے، سرکاری کوٹھی اور فرنیچر جیسا بھی شاندار ہو ان کے گھر کو جاکر دیکھیے تو حیرت ہو جائے۔ ٹوٹا پھوٹا پرانی وضع کا مکان جو اتنے بڑے منسٹر کیا معنی ان کے کسی ماتحت اچھے عہدہ دار کے بھی شایانِ شان نہیں۔ دفن کے موقع پر جو ہزاروں اجنبی باہر سے مسولی پہونچے انھیں کسی طرح یقین نہیں آتا تھا کہ کسی بڑے منسٹر کا مکان اتنا معمولی بھی ہوسکتا ہے! ــــ وضعداری کی ایک یادگار مثال یہ بھی ہے کہ عید بقر عید کی نماز پابندی سے اپنے وطن مسولی ہی میں آکر پڑھتے تھے۔

سمجھا ہے جس طرح ایک بار ملنے لیں عمر بھر اسی طرح ملے گئے نہ نخوت اور خود بینی کا مفہوم

ان کے دماغ سے غائب تھا۔ خلوت میں جلوت میں اندر باہر کہیں بھی ملتے یہ کہیں سے معلوم
نہ ہونے پاتا کہ ملاقات کسی وزیر مملکت سے ہو رہی ہے یو۔پی میں زمینداری ٹوٹی بلکہ
کی تحریک پر ٹوٹی یہ بھی ایک چھوٹے زمیندار تھے اپنی زمینداری کو بچا لے جانا ان کے
کیا مشکل تھا مطلق کوئی تدبیر نہ کی اپنے عہدہ سے اپنی ذات کے لیے کسی ادنیٰ فائدہ
اٹھانے کا سبق انہوں نے پڑھا ہی نہ تھا سوتیلی والدہ زندہ ہیں خاندان کے ایک صاحب
کی روایت سننے میں آئی کہ ایک روز انھوں نے فرمایا رفیع زمینداری تو خوب ختم کر دی،
اب گھر کا خرچ کیسے چلے گا خاندان بھوکا مرے گا سب کا انتظام کیا اپنے گھر کے لیے کچھ نہ
۔ رفیع مرحوم ہنس کر بولے (اور یہ ہنس کر بولنا ان کی عادت تھی) کہ اماں جان آپ گھبراتی
کیوں ہیں زمینداری ختم ہو جانے سے کیا ہوتا ہے میں گھر پائے کر گھاس چھیلوں گا آپ بوجھ
کر بیچئے گا۔ سب کی روٹی چل جائے گی ۔ یہ جواب دنیا دار انسانوں کے بس کا نہ
تھا ــــ اس کے لیے اعتماد اولیاء اللہ کا سا ہونا چاہیے۔

مجھ سے دو ہی سال چھوٹے تھے اور مرتبہ کی بڑائی تو ظاہر ہی ہے لیکن ملتے تو اس
طرح کہ جیسے سن میں مرتبہ میں ہر حیثیت سے میں بہت چھوٹے ہیں اور کچھ میری ذات سے خصوصیت
نہ تھی ہر ایک کے ساتھ یہی حال تھا۔ ماہوار ہزاروں کماتے اور ہزاروں اڑا دیتے خدا نخواستہ
راگ رنگ کھیل تماشے شراب کباب میں نہیں عزیزوں کنبہ والوں کی تنخواہوں میں عزیبوں
مفلسوں کی اعانت میں طالب علموں کی فیس میں اور ایسے ہی مد خیر میں، کوٹھی مستقل مہمانخانہ
تھی جسے دیکھیے ٹھہرا ہوا ہے دستر خوان کی وسعت کیا کہنا چاہیے کہ کوئی حد ہی نہ تھی آج
کسی یتیم کی سرپرستی کر رہے کل اس نادار لڑکی کی شادی کرا رہے ہیں ابھی ایک طالب علم
سے تو ایک معقول چک کر ہی چکے تھے کہ دوسرے صاحب صورت سوال بنے ہوئے
آگے بڑھ کر سامنے آ گئے ایک دربار فیض تھا کہ مسلسل جاری تھا ــــ ذاتی مکان اور
لباس کی بدحالی کا راز اب حل ہوا یا اب بھی راز ہی رہا؟

سیاسی مخالفین سے دوستی کا حق ادا کرتے رہنا بڑے جگر کا کام ہے کانگریس لیگ
کے مناقشہ کے زمانہ میں بڑے بڑوں کو اس امتحان میں بُری طرح فیل ہوتے دیکھا اور اب
اس ٹھنڈے زمانہ میں بھی ذرا کسی نیشنلسٹ صاحب کے سامنے لیگ یا پاکستان کا نام
لے کر تو دیکھئے یہ ظرف اللہ نے مرحوم قدوائی ہی کو دیا تھا کہ اپنی نیشنلزم پر پورے سو
فیصدی قائم و ثابت قدم رہ کر اسے اپنی جان کے برابر عزیز رکھ کر بدگوئی نہ پاکستان کی کرتے نہ لیگیوں
کو برا بھلا کہنے کے لئے وقت نکال پاتے ـــــ اپنے اسلام پر منفعل و محجوب سے نہ تھے ان
کے سامنے کسی کی مجال نہ تھی کہ اسلام پر مضحکہ تو خیر الگ رہا مسلمانوں پر بھی طنز و طعن کر سکتا
اگست و ستمبر ۱۹۴۷ء کے قیامت خیز زمانہ میں جب دہلی کے زمین و آسمان خون مسلم کے پیاسے
نظر آتے تھے انھوں نے خدا معلوم کتنوں کی جانیں بچائیں اور کتنوں کے پاکستان پہنچ جانے کا
انتظام کیا۔

بڑے اور صاحب اقتدار شخص کے دشمن سیکڑوں ہزاروں ہوتے ہیں۔ رفیع مرحوم
نے اپنی سلامت روی اور شرافت نفسی کے طفیل اپنا دشمن شاید ہی کوئی چھوڑا ہو
سیکڑوں یتیم آج انھیں رو رہے ہیں، صدہا بیوائیں ان کا سوگ منا رہی ہیں اور ہزاروں انسانوں
کو آج دل سے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ ان کا دُنیوی سہارا پاش پاش ہو گیا اور وہ
ایک جنگل میں بے یار و مددگار رہ گئے ہیں! اللہ بال بال مغفرت فرمائے اور بلند سے بلند
مرتبے عطا فرمائے۔

"خوش نصیب گول کیپر"

تاریخ اور مہینہ تو بھلا اب کسے یاد، سنہ غالباً ۱۹۰۸ء تھا اور جاڑوں کا زمانہ، علی گڑھ کی فٹ بال ٹیم، لکھنؤ میچ کھیلنے کو آئی۔ ادھر علی گڑھ کے کھلاڑی گیند بلے کے کرتب میں اپنا سکہ جمائے ہوئے، ادھر لکھنؤ کی خلقت کھیل تماشے کے شوق میں نام چمکائے ہوئے، شہر میں ایک دھوم مچ گئی۔ میچ پرانی کیننگ کالج گراؤنڈ پر تھا۔ قیصر باغ کے مشرقی و شمالی سرے پر تماشائیوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے، امیر، غریب، جوان، بوڑھے، طالب علم، سودے والے بھی اور اسی ہجوم میں ان سطور کا راقم ایک اسکول کا گمنام طالب علم بھی۔ علی گڑھ کے کھلاڑی ایک سے بڑھ کر ایک لیکن تماشائیوں کی نظریں بس علی گڑھ کے گول کیپر پر جمی ہوئیں۔ ایک سرخ و سفید قوی و تنومند خوش رو نوجوان پہاڑ کی طرح اٹل اور چٹان کی طرح مضبوط، معلوم یہ ہوتا تھا کہ گول کیپری کے فرائض کے لئے ہی خلق ہوا ہے۔ لکھنؤ کی ٹیم بے طرح جوش اور ولولہ کے ساتھ بھر بھر کر کیسے کیسے حملے کرتی اور ہر حملہ اسی گول کیپر کے تصدق میں ناکام! بس یوں سمجھئے کہ سمندر کی غضبناک موجیں اپنی سطح سے اچھل اچھل کر حملہ آور ہوتیں اور پھر کی چٹان سے ٹکرا کر پھر واپس چلی جاتیں! یہ تھا علی گڑھ کالج کا ہونہار نوجوان اور شیروانی خاندان کا چشم و چراغ، تصدق۔ "کون کہہ سکتا تھا کہ اسے چند ہی روز بعد کھیل کود میں نہیں، فٹ بال فیلڈ کے سو پچاس گز کے محدود رقبے کے اندر نہیں، سیاسیات کی بیابان کی سنجیدہ اور خشک دنیا میں ہندوستان بھر کے طول و عرض رقبہ میں بڑی بڑی زبردست حریفوں کا مقابلہ میں ملک و ملت کی گول کیپری کے فرائض انجام دینے ہوں گے!

سب سے پہلی زیارت یوں ہوئی۔ کچھ ہی دنوں میں یہ سننے میں آیا کہ یہ کھیل کا مرد میدان

یونین کا وائس پریسیڈنٹ ہے اور اچھا جید مقرر بھی. یونین کے وائس پریسیڈنٹ کے مرتبہ کو
سمجھ سکتے ہیں جو علی گڑھ سے واقف ہیں۔ دل خوش ہو گیا کہ جو جسم کا دھنی تھا ہی اس کا دا
بھی کورا نہ نکلا! ــــ چار یا پانچ برس کی درمیانی مدت چھوڑ جائیے ــــــــــ اب سلا
آتا ہے اور اس کے دسمبر کا آخری عشرہ لکھنؤ کی سرزمین رعشہ میں ہے اور پرانے قومی لیڈر
کے قلوب لرزہ میں! ایجوکیشنل کانفرنس مسلم لیگ، مسلم یونیورسٹی، فاؤنڈیشن کمیٹی ہر قو
ادارہ میں، کامریڈ، ہمدرد اور الہلال کی معجزانہ تحریروں کے اثرات رونما ہو رہے ہیں. آزادی کی
کا بگل بج چکا ہے. "وفاداریٔ حکومت" اور "مطالبۂ حقوق" کے درمیان پوری شد و مد کے ساتھ
طاقت آزمائی ہو رہی ہے. ایک طرف سب کے سب پرانے لیڈر ہیں یعنی وہ آقا جن کی
اس وقت تک قانون کا حکم رکھتی ہیں اور دوسری طرف باغی، ابوالکلام و شوریدہ سر محمد
ہمراہ چند نوعمر رفیقوں کے. ان گنے چنے رفیقوں میں آپ کو باعتبار ظاہر جو سب سے نمایا
نظر آرہا ہے اور بلحاظ باطن بھی وہ کس سے کم ہے؟) وہ وہی پرانا گول کیپر ہے. تصدق احمد خا
شیروانی علی گڑھ کا گریجویٹ اور لندن سے لوٹا ہوا تازہ وارد بیرسٹر

آج سے محمد علی جو تحریک اٹھاتے ہیں، چاہے وہ کالج اور یونیورسٹی کی اصلاح کی ہو
جنگ بلقان کے چندے کی یا قوم و ملت کی آزادی کی، تصدق شیروانی سب میں سب سے پیش پی
پیش دل جرنل کا ایک پیش دل لفٹیننٹ. یہاں تک کہ ۱۹۲۰ء کی وہ ہنگامہ خیز تحریک خلا
ترک موالات شروع ہوئی جس نے سارے ملک کو اس سرے سے اس سرے تک ہلا ڈالا
تصدق اس وقت ایک کامیاب بیرسٹر ہو چکے تھے اب اپنے پیشے میں نامور، گھر کے خوش
پہلے ہی تھے اب تو خاصی عیش کی رئیسانہ زندگی بسر کر رہے تھے. قوم کے سرداروں کا حکم
کہ پریکٹس چھوڑ دو، بڑھتی ہوئی آمدنی سے موالات ترک کر دو جو سر اس حکم کے آگے سر
پہلے جھکے ان السابقون الاولون میں ایک یہ بھی تھے . غالباً ۲۲ء [illegible] علی گڑھ

دالت کے سامنے ایک بڑا ہجوم ہوا۔ شیروانی صاحب کا مرغزر کرنے گئے۔ پولیس اور مقامی حکام کو
دل کے بخار نکالنے کا موقع ہاتھ آگیا۔ دھر پکڑے گئے۔ الٹا الزام اشتعال انگیزی کا لگا:
لے تھے آگ بجھانے، مجرم آگ لگانے کے قرار پائے اور وہ جس کا کام قصور وار دل کا چھڑانا
تھا اور خطا کاروں کو رہائی دلاتا تھا، اب خود مجرم و بے خطا قید فرنگ میں اسیر و
محبوس تھا! ـــــ قید اور پھر قید سخت! غالباً کچھ روز کے لئے قید تنہائی بھی! اس
نفیس اور رئیس زادے کو بھلا اس سے مناسبت ہی کیا تھی؟ بڑی بڑی تکلیفوں کو
جھیلئے۔ تنگ و تاریک کوٹھری میں مچھروں ہی نے ایسا جھنجھوڑ ڈالا کہ بے حال ہو گئے اور
کندن بن کر نکلے۔ ماں باپ نے نام تصدق رکھا تھا۔ کیا یہ نام نام ہی رہتا؟ اور عزت کی؟
نام کی، مال کی، جان کی قربانی کچھ بھی نہ طلب کی جاتی؟

⁂

چھوٹے اور پھر پکڑے گئے، آزاد ہوئے اور پھر جکڑے گئے، وہ زندگی ہی کتنی تھی
جو گزار آئے تھے لیکن بہرحال جو کچھ بھی لکھا کر لائے تھے بس سب اسی الٹ پھیر میں
گزار دی! ابھی دیکھئے تو علی گڑھ کی عدالتوں میں ہیں۔ الٰہ آباد میں صوبے کی عدالت العالیہ
کے نامور ایڈوکیٹ ہیں اور دوسروں کی بگڑی بنا رہے ہیں۔ موتی لال کے مشیر اور جواہر
لال کے شریک و رفیق ہیں۔ کانگریس کو اپنے اشارات پر چلا رہے ہیں اور ابھی معلوم
ہوا کہ لق و دق کوٹھی، سجی سجائی موٹر، نفیس مسہری اور دلکشا پائیں باغ، سب چھوڑ
چھاڑ چوروں اور اٹھائی گیروں کی سی میلی کچیلی جانگھیا پہنے کھڑے ہوئے لعب زلوں
اور گرہ کٹوں کی قطار میں صبح گدڑی اوڑھے لپیٹے جیل کی کھردری زمین پر پڑے گئے
۔۔۔ بلند ہوا اقبال۔ سرکار نامدار کا، جوہر شناسی اسے کہتے ہیں، قدر دانی اس کا نام ہے۔
ہندوستان کی سرزمین کو کبھی کبھی ایسی، خوش مذاق، نکتہ نواز، قدر شناس حکومت
سے واسطہ پڑا ہوگا۔ ـــــــــ

مرنے والا مرچکا جینے والے اپنے اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر بتائیں کتنے ایسے ہیں جو ایسے امتحانوں میں ثابت قدم نکلیں گے؟ ماں باپ نے تعلیم میں ہزاروں روپے بے دریغ اسی دن کے واسطے اٹھائے تھے؟ کالج میں یہی ارمان دل میں تھے ولایت اسی کی خاطر گئے تھے؟ بچپن کے ساتھیوں اور نوجوانی کے دوستوں میں آج کوئی جج تھا. کوئی ہائی کورٹ کا جج. کوئی ہزاروں کما رہا تھا. کوئی ہزاروں نثار رہا تھا کوئی صوبے کا منسٹر کوئی ایگزیکٹیو کونسلر کیا اس غریب کی قسمت میں یہی دن کاٹنے تھے اور یونہی ساری عمر بسر کر دینی تھی؟ اس کے پہلو میں دل کی جگہ کوئی پتھر کا ٹکڑا تھا؟ اُس کے دل میں اُمنگیں باقی نہیں رہی تھیں؟ کیا وہ بھی کوئی ہندو سنیاسی یا مسیحی راہب بن چکا تھا.؟ کیا اس کے بیوی بچے دوست عزیز بھائی مبدنہ تھے. کیا ان سب کے ساتھ ہنسی خوشی رہنے سہنے دنیا کا چین کرنے، زندگی کے سُکھ اٹھانے کی آرزوئیں دل میں مردہ ہو چکی تھیں؟ کیا اس کے بشری جذبات کا سرچشمہ خشک ہو چکا تھا؟ کیا تکلیف اسکے لئے تکلیف اور راحت اس کے لئے راحت رہ ہی نہیں گئی تھی؟ ہو سکے تو سوچنے والے سوچیں.

محمد علی جیل جاکر شاعر ہو جاتے تھے ۲۱ء یا ۲۳ء کی قید سے جب نکلے تو غزلوں کا ایک پشتارہ ساتھ لئے ہوئے. شوخی تو کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی شاعری میں خدا جانے کہاں کہاں پہونچ جاتے. جیل خانے سے قبل مسلم یونیورسٹی کے معاملات میں علی گڑھ کے شیروانی خاندان کے بعض اکابر سے بہت رنج اٹھا چکے تھے. رہائی کے بعد پہلی ملاقات ہوئی تو خوب اشعار سننے میں آئے. ایک بڑی سی غزل اس زمین میں سنائی "بیابانیوں میں ہم" "پریشانیوں میں ہم" اس میں ایک مشہور وفادار علی گڑھی بزرگ کی زبان سے فرمایا گیا تھا ؎

شرط وفا یہی ہے تقاضائے دیں یہی گڈڑی کے ساتھ جاملیں لونانیوں میں ہم

(ایک، اینگلو انڈین کرنل گڈنی نے مسلمانوں کے مجوزہ مہیش انگورہ کے مقابلے میں ہیش یونان کی تحریک کی تھی۔ یہ اشارہ اسی طرف تھا) اور نواور اپنے ٹھیا تک کو نہیں چھوڑا تھا ۔

شوکت یہ کہتے ہیں وہ تن توش جب نہیں
پھر کیوں گھسیں نہ اپنے کو رکھ دانوں میں ہم

(خبر آئی تھی کہ مولانا شوکت علی راجکوٹ جیل میں رہ کر بہت لاغر ہوگئے ہیں یہ تلمیح اسی کی ہوئی سناتے سناتے ارشاد ہوا کہ مزے کا شعر "تصدق" کی زبان سے کہا ہے اسے ضرور سنو ۔

یہ ظلم ہے کہ سب کچھ کر دا ایک سا خیال
پاتے ہیں عقل بھی کبھی شروانیوں میں ہم

÷ ~~~~ ÷ ~~~~ ÷

[1] شروانیت کے امتحان کا اصلی وقت اختلاف و مخالفت کے موقع پر آتا ہے یوں تو جب تک دوستی دیکھ لیجیے، سبھی اچھے نظر آتے ہیں۔ محمد علی سے شروانی کا سیاسی اختلاف ۱۹۲۴ء سے شروع ہو گیا تھا۔ روز بروز بڑھتا چلا گیا۔ ادھر آغاز ۱۹۳۰ء میں مولانا کی مالی حالت اس درجہ ابتر ہوگئی کہ دیکھنے والے کلیجہ تھام کر رہ جاتے تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ صبح کی شام اور شام کی صبح کیونکر ہوگی مولانا کی لاعلمی میں دو چار نیاز مندوں نے سر جوڑ کر یہ طے کیا کہ مخصوص مخلصوں سے کچھ ماہوار رقمیں جمع کرلی جایا کریں۔ نام بڑے بڑے محبت و عقیدت کے دم بھرنے والے بعض اچھے اچھے بزرگوار اس امتحان میں نکل گئے۔ شیروانی کے عزیز ترین دوست ڈاکٹر سید محمود نے ان کا نام بھی رکھا تھا۔ میں ذکر کرتے ہوئے جھجکا رہا تھا۔ الہ آباد میں ایک بار جی کڑا کر کے تذکرہ کیا تو مرحوم نے اس فراخدلی اور خندہ جبینی کے ساتھ لبیک کہا کہ مسرت کے ساتھ حیرت ہو کر رہ گئی۔ یہ معلوم نہیں

ہوتا تھا کہ آپ کسی سیاسی حریف کا ذکر کر رہے ہیں۔ بہر حال وہ تجویز تو عمل میں کبھی بھی نہ آسکی۔ زیادہ تر مولانا ہی کے انکار و استعفار کی بنا پر، لیکن شیروانی کی اس شرافت کا نقش دل پر بیٹھ گیا۔ اللہ مغفرت فرمائے اور درجات بلند سے بلند تر کرے خوبیاں بہت تھیں، اس محبت و اخلاص اس مروت مردانگی اس رواداری و فراخدلی، اس ذوق خدمت و تحمل مصائب کی مثالیں کم تر دیکھنے میں آئی ہیں۔ جمعہ کے دن کی موت، عین فجر کے وقت، ہر ایک نصیب میں آتی بھی تو نہیں ہے۔ اور پھر ہزارہا مسلمانوں کی دعائیں۔ خوش نصیب گول کیپر دنیا اور آخرت دونوں جگہ بازی لے گیا۔ !

عبد المجید خواجہ مرحوم[۱]

زندگی اور زندہ دلی کے پیکر مجسم خواجہ کو آج کسی دل سے مرحوم لکھا جائے! لیکن دل چاہے یا نہ چاہے بہر حال قضا ہی ہے اور اس کے سر جھکانے کو ہم آپ کیا معنی ہر جن و بشر پیدا ہی ہوا ہے! ـــــ علی گڑھ کی خبر ۳ دسمبر (دوشنبہ) کی ہے کہ آج گیارہ بجے دن کو۔ عبد المجید خواجہ ۰، ۷۷، سال کی عمر میں اپنے وطن حقیقی کو سدھار گئے! آہ غفلت کی گھڑیاں اور ہم نادانوں کی مدہوشیاں! وہ حسین کا نوجوانی کا چھوٹا نازپرورده اور چہکتا دمکتا ابھی کل ہی کی بات معلوم ہوتا ہے۔ آج اس سن کو پہونچ گیا تھا!

خواجہ "ذات یا برادری کا نام نہیں ان کا گھریلو عرف تھا اور یہ اتنا چلا کہ ان کے نام کا جز بن گیا۔ ہم نیازمندوں کی زبان پر صرف خواجہ تھا۔ پورا نام صرف ضابطہ ہی کے موقعوں پر لیا جاتا ـــ

---

[۱] منقول صدق جدید ۱۴ دسمبر ۱۹۶۲ء

علی گڑھ سے اخلاص ترکہ میں پایا تھا ان کے والد محمد یوسف مرحوم سرسید کے مخصوصین میں سے تھے۔ شادی نواب محمد سمیع اللہ خاں مرحوم کی پوتی سے ہوئی۔ یہ سمیع اللہ خاں وہی ہیں جو ابتدا تحریک علی گڑھ میں سرسید کے مخلص ترین رفیق ہی نہیں بلکہ کہنا چاہیے کہ برابر کے سہیم و شریک تھے۔

علی گڑھ میں پڑھ کر ولایت گئے کیمبرج سے بی اے کیا۔ لندن رہ کر بیرسٹر ہوئے واپسی پر بیرسٹری پہلے پٹنہ میں شروع کی پھر علی گڑھ میں اس کے بعد الہ آباد ہائی کورٹ میں آخر میں سالہا سال سے پھر علی گڑھ آ گئے تھے اور سارا وقت قومیات کی نذر کرنے لگے تھے۔ آخیر میں بیرسٹری سے بالکل ہی دست بردار ہو گئے تھے، قومی اور ملی دلچسپیاں آخر تک نہ چھوڑیں بلکہ اب ان مشغلوں سے انہماک، صحت سخت خراب رہنے کے باوجود بڑھ ہی گیا تھا۔

اللہ نے حسن ظاہری سے مالا مال کیا تھا۔ ولایت کی آزادیاں اس پر مستزاد۔ خواجہ صاحب کڑے امتحان میں پورے اترے، لندن جس طرح پاک صاف گئے تھے اسی طرح پاک صاف واپس آئے۔ یہ مجاہدہ تھا وہ یہ کیا کہ شراب نوشی وغیرہ کا کوئی چھینٹا تک اثر نہیں کرنے پایا تھا۔

اللہ نے پیسہ بھی دیا تھا۔ خواجہ پیسے کا صحیح استعمال جانتے تھے۔ مسرفانہ طور کے بغیر بڑے مہمان نواز تھے، مکان کھچا کھچ مہمانوں سے بھرا ہوا بلکہ قومی اجتماعوں کے موقعوں پر تو یہ معلوم ہونے لگتا تھا کہ مکان کوئی مستقل مہمان سرا یا ہوٹل ہے! پر تکلف خاطر داریاں، دعوتیں، پارٹیاں مع سارے لوازم کے۔

مولانا محمد علی ایڈیٹر کامریڈ کی لیڈری ۱۹۱۳ء سے شروع ہوئی تو یو پی کے دو گروپ خاص طور پر اس شمع کے گرد پروانہ وار جمع ہو گئے ایک حلقہ میں یہی علی گڑھ کے مجید خواجہ، ڈاکٹر سید محمود، تصدق احمد خاں شیروانی اور ڈاکٹر ناظر الدین حسن (اب نواب ناظر یار جنگ حیدرآبادی) تھے اور دوسرا حلقہ چودھری خلیق الزماں، شعیب قریشی مرحوم، عبدالرحمن صدیقی مرحوم۔ اور

عبدالعزیز انصاری کا تھا، ڈاکٹر ست محمود کو یکساں عقیدت مولانا ابوالکلام سے بھی تھی۔ دہلی
مسجد کانپور میں مسلم یونی ورسٹی کی تحریک میں، طرابلس کے چندے میں، جنگ بلقان کے چندے میں
اور آخر میں تحریک خلافت میں، تحریک جامعہ ملیہ، ترک موالات میں، مسلم لیگ میں، خواجہ پُرجوشی
سرگرمی سے حصّہ لیتے رہے۔ اور ان کی شرکت، ہمدردی ہمیشہ "باغیوں" ہی کے ساتھ رہا کی۔

مولانا محمد علی سے اختلاف آخر ۲۳ء ہی سے شروع ہوگیا تھا مسئلہ داخلہ کونسل
کے سلسلے میں خواجہ، پنڈت موتی لال نہرو، سی۔ آر۔ داس وغیرہ کے ساتھ داخلہ کونسل کے حق میں
ہوگئے۔ مولانا محمد علی، گاندھی جی، راج گوپال آچاریہ وغیرہ کے ساتھ بدستور تو چینجر تھے یعنی
داخلہ کونسل کے مخالف پھر آخر ۲۸ء میں جب نہرو رپورٹ کے سلسلے میں مسلمان آزادی خواہوں
کے درمیان شدید تفریق کی بنیاد پڑی تو خواجہ صاحب کا اختلاف مولانا محمد علی سے اور
مسلم لیگ سے اور زیادہ گہرا ———— اور نمایاں ہوگیا اور یہ آخر دم تک
برقرار رہا۔

جب مسلم لیگ اور کانگریس کے دو بالکل مختلف کیمپ قائم ہوگئے اور رنجشیں تنخ سے
تلخ تر ہوگئیں تو خواجہ نے مسلم لیگ کے توڑ پر ایک آل انڈیا مسلم مجلس قائم کی اور خود اس کے صدر
منتخب ہوگئے گو یہ مجلس بھی کچھ زیادہ نہ چل سکی۔

مدتوں جامعہ ملیہ میں بہ حیثیت شیخ الجامعہ (پرنسپل) کا کام کیا اور اس کے ممبر رجسٹرار
تو دم آخر تک رہے۔ وہ زمانہ قناعت سادگی اور جفاکشی کے دور دورہ کا تھا۔ خواجہ نے بھی
اس مہم میں حصّہ لیا اور سفر انٹر کلاس میں کرنا شروع کر دیا۔ حالاں کہ آنکھیں دولت و ثروت میں
کھلی تھیں۔ شعر و سخن کا یہی نہیں کہ اعلیٰ مذاق رکھتے تھے اور شعر کے خوب پرکھنے والے تھے بلکہ
خود شاعر بھی تھے اور حکیم اجمل خاں مرحوم کی طرح تخلص شیدا رکھے ہوئے

علمی مذاق عجب جامع پایا تھا۔ باضابطہ عالم دین نہ تھے۔ لیکن علوم دینیہ میں مہارت اچھی
خاصی تھی۔ تفسیر، حدیث، فقہ، کلام کسی موضوع میں جامد نہ تھے اور بعض فرقوں سے تو مناظرہ میں

توکہنا چاہیے کہ مہارت کامل رکھتے تھے۔ مسلکاً تو اہل حدیث تھے لیکن حنفیوں سے ایسے شیر و شکر رہتے تھے کہ کبھی ان پر گمان بھی غیر حنفی ہونے کا نہیں ہوتا تھا۔

حسرت موہانی مرحوم کی طرح خواجہ بھی اکثر معاملات میں و مسائل میں اپنی رائے ایک منفرد رکھتے تھے اور اس کا اظہار بڑی صفائی اور بے باکی سے بڑے چھوٹوں سب کی محفل میں کر ڈالتے تھے۔ اور کمیٹیوں میں شاید ہی کوئی میٹنگ ایسی ہوتی ہو جس میں خواجہ اپنی ترمیم یا امنڈمینٹ پیش کرنے نہ کھڑے ہو جاتے ہوں۔ اس سے بالکل بے نیاز کہ کوئی ایک اور ان کی موافقت میں اٹھتی ہے یا نہیں ـــ البتہ چونکہ کھرے نہیں بلکہ شیریں زبان تھے اسی لئے مخالف بھی بگڑتے اور چڑھتے ذرا کم ہی تھے۔ آنکھ اور زبان کی موہنی بھی آخر کوئی چیز ہوتی ہے۔

فرقہ امامیہ کے عقائد سے سخت بیزار تھے اور اپنے خیال کی تائید میں گھنٹوں مدلل گفتگو کر سکتے تھے اس کے باوجود اس فرقے کے افراد سے خوب میل جول رکھتے تھے۔ چنانچہ آخیر عمر میں اپنی جائیداد کے مقدمات وغیرہ جن وکیل صاحب کے سپرد کر رکھے تھے ان کا تعلق اسی فرقہ سے تھا۔

حکایات لطائف و ظرائف کے بادشاہ تھے گھنٹوں پاس بیٹھ کر باتیں سنئے تو طبیعت نہ اکتانے پائے۔

جنرل سکریٹری یو۔پی۔ کانگرس ...... ایک عرصہ تک اور یو۔پی اسمبلی کے ممبر غالباً ۲ سال تک رہے اگر چاہتے اور مزاج کو ذرا اور دنیا داری کے لائق بنا لیتے تو موجودہ سرکار میں بڑے بڑے عہدے آسانی سے حاصل کر سکتے تھے۔

ایمان کے مضبوط اور عبادات کے پابند ہمیشہ سے تھے۔ داڑھی بھی جوانی ہی کے زمانے سے رکھالی تھی جواب بڑی ہو کر خوب سفید اور پر نور ہو گئی تھی گھٹنوں کے درد ضعف سے نماز کھڑے ہو کر نہیں پڑھ سکتے تھے۔ کرسی پر بیٹھ کر یا جس طرح بھی بن پڑتا آخیر تک ادا کئے گئے ـــ غیرت ایمانی اور جوش اسلامی آزادی ہند کے بعد سے بہت بڑھ گیا تھا مسلم یونیورسٹی

کے حال زار پر ہر وقت کڑھا کرتے اور اصلاح حال کی ہر عملی تدبیر میں لگے رہتے۔ یونیورسٹی کے نام سے جب "مسلم" حذف کردینے کی تجویزیں ان کے کان میں پڑیں تو فرط غیرت سے تڑپ گئے اور بول اٹھے کہ میری زندگی بھر تو ایسا نہیں ہوسکتا۔ مشیت الہٰی نے انھیں عین ایسے وقت اٹھالیا جب یونیورسٹی کو ان کی ضرورت سب سے زیادہ تھی۔ اللہ مغفرت بال بال فرمائے۔

قائد ملتؒ

○

موت کا سوچ اکثر آتا ہی رہتا ہے ابھی کل ہی کی بات ہے کہ سوچتے سوچتے خیال یہ آیا کہ موت اگر آج ہی کل میں آگئی تو نماز جنازہ کس سے پڑھوانے کا دل چاہتا ہے؟ نام کئی ایک ذہن میں آئے لیکن سب سے پہلا نام ذہن میں آیا وہ اسی مجاہد اسلام بہادر خاں حیدرآبادی کا تھا۔۔۔ کاش بہادر یار جنگ دورہ کرتے پھرتے پھراتے عین اس وقت اتفاق سے آموجود ہوتے! ایسا کیوں ہونے لگا۔ لیکن دل کی کشش سے ایسا ہو جانا کچھ ناممکن بھی نہیں! ۔۔ یہ تھی اس نامۂ سیاہ کے دل میں اس شیر دل مجاہد ملت کی محبت عظمت اور عقیدت!

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

آہ کہ جس سے یہ امیدیں قائم کی جا رہی تھیں، کسے وہم کر سکتا تھا کہ وہ یوں دھوکا دے جائے گا!

صدق جدید جولائی ۱۹۴۴ء

اور جس کی دعاؤں کے لئے یہ طلب و تمنا تھی وہ خود آناً فاناً دوسروں کی دعاؤں کا مستحق ہو جائے گا!.............. آہ مشتِ خاک انسان اور اس کے تارِ عنکبوت جیسے بودے، کھوکھلے کمزور ارادے حوصلے سہارے!

۴۸ سال کی عمر بھی کوئی عمر تھی! اور پھر کیسے تندرست و توانا، ہنس مکھ اور خوش مزاج، خوش سیرت، خوش صورت، بلا کے ذہین و محنتی، کسی بشر کے دل میں یہ خطرہ بھی گزر سکتا تھا کہ یہ کھلا ہوا پھول جس بھر کو چہکاتا ہوا بات کی بات میں نذرِ خزاں ہو جائے گا، محفل بھر کو منور رکھنے والی شمع اسی لمحہ، اسی آن بجھ جانے کو ہے؟ — کہتے ہیں کہ موت بالکل اچانک ہوئی نہ سکرات نہ تکلیفیں نہ نزع روح کی سختیاں اور کیوں ہوتیں جس سپاہی نے اپنے کو اللہ کی ڈسپلن و اطاعت کا خوگر بنا لیا تھا، اس کی روح پکارنے پر معاً لبیک آخر کیوں نہ کہتی؟ تاخیر و تامل کی وجہ ایک منٹ کے لئے بھی آخر اسے کیا ہو سکتی تھی.؟ —— رہبرِ دکن والے رہبرِ ملت[1] کی دو سال پہلے کی فوری موت کا راز بھی اب کچھ کچھ سمجھ میں آیا، جو دنیا میں نقیب تھا اس سے آخرت میں بھی نقیب ہی کا کام لیا گیا اور عجب کیا جو دنیا میں خدمتِ ملت کے دلوانے اور فلاحِ امت کی خاطر ایک دوسرے کے دست باز و رفیق، ہمراز و دمساز تھے، انھیں جنت میں بھی ان کی خواہش پر ہی مستقل تفریح دیدیا گیا ہو، جو یہاں مجھ کے ذکر کا سودائی تھا عجب تھا کہ جنت کی ہواؤں نے اس کو تیز سے تیز تر کیا ہو!

حیدرآباد کے مسلمانوں کی حالت کا مشاہدہ جس نے آج سے ۲۰-۲۲ سال پہلے کیا ہے، وہ آج ان حیدرآبادیوں کو پہچان بھی نہیں سکتا۔ اتنے دنوں میں اس کی کایا پلٹ کس نے کر دی؟ جو قوم سرتاسر بے عمل مجہول، افسردہ منتشر اور پست مذاق اور بدنظمی کا شکار تھی، اس میں عمل تنظیم انضباط کی برقی رو کس نے دوڑائی؟ یہ مُردوں کو زندہ کر دینے والی مسیحائی کس نے کر دکھائی؟ حیدرآبادی مسلمان شمالی ہند کے مسلمانوں کے سامنے شرم سے نہیں فخر سے پیش ہو سکے یہ قلبِ ماہیت کس نے کر دی؟ اور جو دکن اجتماعی اور ملی زندگی میں سبق لینے کے قابل

---

[1] مولوی احمد ؔعلی ایڈیٹر مرحوم ایڈیٹر رہبرِ دکن (حیدرآباد)

بھی مشکل سے تھا اسے سبق دینے کے قابل کس نے بنا دیا۔ سارا کارنامہ ظلم لکھنے چلا تھا کر مجاہدی
کارنامہ اسی مرنے والے زندہ جاوید بہادر خاں اور اسی کے چند مخلص رفیقوں ہی کے اعمال نامہ
میں لکھا جائے گا ——— قائدِ ملت جس کسی نے اسے کہا اس نے کوئی شاعری نہیں کی
ادبی صنعت گری لفظی شعبدہ بازی سے کام نہیں لیا ایک حقیقت بیان کر دی۔ تاریخ کی
طرح خشک سائنس کی طرح بے لوث، ریاضی کے اعداد کی طرح اٹل کھری۔ قائدِ ملت داؤد
آج یہ لفظ پہلی بار صدق استعمال کر رہا ہے کاش بجائے دکن کے انگریزی ہند کو نصیب
ہوا ہوتا تو محمد علیؒ کی جانشینی کا سوال لاینحل نہ رہا ہوتا۔ ہندوستان نے دوسرا محمد علی اگر کوئی
پیدا کیا ہوتا تو وہ یہی تھا وہی اخلاص، وہی دینی جوش، وہی تڑپ، وہی سوجھ بوجھ وہی نبض
شناسی وہی ہمت و عزم، غرض بجز محمد علی کی انگریزی انشا پردازی کے اور سب کچھ وہی
——— لیگ کی مذہبی بے راہ روی کی جب کوئی شکایت سننے میں آئی (سنا "اس لئے کہ
شرکت کا اتفاق بطور تماشائی کے بھی ابھی تک نہیں ہوا) دل کو برابر یہی اطمینان رہتا تھا کہ بہادر
یار جنگ جیسے مومن صادق کی ذات دیر سویر انشاء اللہ ہر غلطی کی اصلاح کرا کے رہے گی۔

۲۶ اکتوبر ۱۹۴۳ء مقام علی گڑھ یونیورسٹی کی مجلس تاریخ و تمدن اسلامی کی دعوت
پر میرا اور نواب صاحب دونوں کا بیان ہونے والا تھا۔ نواب سحر بیان کی خطابت بچہ بچہ
سے خراج تحسین حاصل کئے ہوئے، اہل جلسہ نے غلطی اور شدید غلطی کر کے مجھ جیسے ہیچ زبان
کا وقت اس بلبل ہزار داستان کے ساتھ ہی رکھ دیا۔ وسیع اور لق و دق اسٹریچی ہال اوپر
سے نیچے تک کھچا کھچ بھرا ہوا۔ سامنے جو لاؤڈ اسپیکر لگا ہوا تھا اس نے جواب دے دیا۔ اب بھلا
میری آواز کیا پہنچتی۔ ایک صاحب نے کھڑے ہو کر کہہ دیا کہ ہمارا وقت خواہ مخواہ ضائع ہو
رہا ہے کچھ سنائی نہیں دیتا اور ہم تو نواب صاحب کے مشتاق ہو کر آئے ہیں۔ میں تو پہلے ہی
بیٹھنے پر آمادہ تھا فوراً صدر صاحب سے معذرت کر کے ڈائس سے اترنے لگا۔ معاً نواب صاحب
کھڑے ہو گئے اور گرج کر بولے کوئی سننے یا نہ سنے کوئی بیٹھے یا چلا جائے میں خود مولانا کے
لکچر کو اول سے آخر تک سنوں گا۔ میں تو انہیں کا لکچر سننے آیا ہوں اور جب تک وہ اپنا لکچر

تم نہ کرلیں گے میں ہرگز ایک لفظ بولنا نہ شروع کرونگا :
مجمع میں سناٹا چھاگیا تھا ! ——— ہے کہیں اس دور میں اس شرافت کی
ل — ؟

۲۰ اپریل ۱۹۳۲ء لکھنؤ میں نواب صاحب یوم اقبالؒ کی صدارت کرکے ندوہ میں ڈالی باغ
گنگا پرشاد میموریل ہال میں متعدد جلسوں میں معرکہ کی تقریریں کرکے صبح کی گاڑی سے

دلی حیدرآباد واپس جارہے ہیں میں صبح ۸ بجے ان کی قیام گاہ پر پہونچا ہوں خیال یہ
یہاں سے اسٹیشن تک مفصل بات چیت رہے گی. موٹر اسٹارٹ ہوتا ہے ادھر نواب صاحب
زبان دعاؤں پر کھلتی ہے. سواری پر سوار ہونے کی دعا ہوگی. ابھی ختم ہوئی جاتی ہے لیکن
یا؟ کہاں ابھی ختم ہوئی. دو سکنڈ چار سکنڈ، ایک دو دعائیں، یہ سلسلہ ہے کہ ختم ہونے
تا. اور دعائیں زیادہ تر حدیث کی. یا الٰہی یہ آل انڈیا لیڈر ہیں یا حصن حصین کی قسم کی کوئی
ب! شرم سے کٹا جارہا ہوں کہ لوگ مجھے عالم اور مفسر اور خدا معلوم کیا کیا سمجھ رہے
یہاں تو ان کی آدھی دعائیں بھی یاد نہیں ان کا ورد سفر تک رکھنا تو خیر الگ رہا یہاں
دھی نہیں! اب انتظار کہ نواب صاحب کا خشوع وخضوع کچھ کم ہولے تو ادھر اپنی بنا
بان کھلے مگر تو بہ اس کا موقع ہی کیوں آنے لگا. دعاؤں کا سلسلہ نہ ختم ہونا تھا نہ
یہاں تک کہ اسٹیشن آگیا! ——— ایک مولانا عبدالباری فرنگی محلی کو مستثنیٰ کرکے اور
لیڈر کی چاہے وہ آل انڈیا ہوں یا صوبہ وار مذہبی اعمال میں مصروفیت کی ایسی مثال
اس کے قبل اپنی آنکھوں نے دیکھی تھی نہ اس کے بعد.

کس کو لاتے ہیں بہر دفن کہ قبر
ہمہ تن چشم انتظار ہے آج!

خوش نصیب قبر خوش ہو کہ تجھ میں آرام پانے کے لئے اللہ کے دین کا دلیر و باہمت سپاہی
ہے، وہ غریبوں کا سہارا تھا، بےکسوں کا والی تھا، ملت کا پشت پناہ، وہ ایک امیر

گھرانے کا چشم وچراغ تھا اور مجھ سے ان سے پہلی ملاقات جب حیدرآباد میں غالباً ۱۹۲۹ء میں میرے عزیز ترین دوست اور ہمدم مولوی سید امین الحسن بسمل موہانی مرحوم کے مکان پر مولانا عبدالرحیم صاحب (سابق انجمن اسلامیہ والے اور حال تفسیر القرآن والے) کی وساطت سے ہوئی تھی تو میں اس قدر سمجھا تھا کہ ایک خوش مذاق وعلم دوست نوجوان ہیں! ان کے نفیس موثر کی چمک دمک آج تک یاد ہے، دل ودماغ روح وضمیر کے یہ حیرت انگیز اور قابل صد رشک جوہر تو رفتہ ہی رفتہ کھلے۔

حکیم مطلق اور احکم الحاکمین بے نیاز کی مشیت میں دم مارنے کی مجال کس کو؟ کیسے کیسے باغی، وطاغی، غدار وسرکش، اشقی بحاشقی کی عمروں کے پورے عیش وعشرت کے ساتھ زندگی کے دن پورے کر رہے ہیں اور یہ مطیع وفرمانبردار بندہ، دین کا سپاہی، اور امت کا علمبردار جوانی ہی کی عمر میں ہی واپس بلالیا جاتا ہے سچ کہا اس عارف نے جس نے یہ کہا۔ ؎

ما بردریم دشمن و مامی کشیم دوست
کس را رسد نہ چون وچرا در قضائے ما

روایتوں میں آیا ہے کہ خلیفہ برحق عمر فاروق رضی نے جب عین میدان قتال میں خالد سیف اللہ کو معزول کر دیا تو ایک وجہ یہ بھی بیان فرمائی کہ لوگوں کا تکیہ حق تعالیٰ سے زیادہ خالد پر ہو چلا تھا اور یہ سمجھا جانے لگا تھا کہ فتوحات جو حاصل ہو رہی ہیں یہ خالد کی شجاعت وتدبیر کا نتیجہ ہیں، میں اس خیال کو مٹا دینا چاہتا ہوں — عجب کیا، جو ایک مصلحت کچھ اس طرح کی اس جوانمرگ قائد ملت کی موت میں بھی ہو۔ ملت بہت زیادہ تکیہ اس پر کرچلی تھی اور مشیت تکوینی کو سبق یہ دینا منظور ہو کہ جو خدائے قادر وتوانا اس بندہ کے توسط سے نصرت وکامرانی پر قادر ہے، وہی اسی واسطے کے بغیر بھی اسی طرح قادر ومتصرف ہے۔

شعیب قریشی مرحوم

کراچی کی اطلاع ۵ر فروری کی ہے کہ شعیب قریشی نے علالت کے ساتھ وفات پائی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ بہت سی زبانوں پر سوال آجائے گا کہ یہ تھے کون؟

کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

جواب کیا دیا جائے سوا اس کے کہ نیرنگئ دہر کا ایک جیتا جاگتا نمونہ! بڑھے تو کیا سے کیا ہو گئے۔ اور گھٹے تو کیا ہو کر رہے۔

علی گڑھ کے رہنے والے اور وہیں کے ایک ممتاز ترین گریجویٹ لڑکپن ہی میں ماں باپ بھائی بہن سب دو چار دن کے اندر وبائے ہیضہ کی نذر ہو گئے اور یہ بے خانماں اور بالکل بے سہارا رہ گئے کچھ عرصہ کے بعد جو دھری خلیق الزماں کے منھ بولے بھائی بن گئے ایک آپریشن کے سلسلہ میں ان کی والدہ کا خون ان کے خون سے مل گیا اور اس طرح رشتہ بھی خونی قائم ہو گیا لیے بے باک غیور خود دار ذہین وجفاکش شروع سے تھے۔ اور خدمت ملک وملت کے امداد کا ۱۲ء میں بسلسلہ جنگ بلقان ڈاکٹر انصاری کے طبی مشن میں شریک ہو کر ٹرکی روانہ ہو گئے۔ انگریزی تقریر و تحریر دونوں پہ قادر ۱۶ء میں جب غلام حسین مرحوم ایک حادثہ کا شکار ہو گئے تو ان کے انگریزی ہفتہ وار نیو ایرا کی ایڈیٹری انھیں کے حصہ میں آئی پھر کئی سال بعد احمد آباد میں گاندھی جی کی غیر حاضری میں ان کے شہرۂ آفاق ہفتہ وار ینگ انڈیا بھی چلاتے رہے بیرسٹری کی تعلیم کے سلسلہ میں لندن میں مسلم آؤٹ لک کی ادارت میں بھی

شریک رہے جیل گئے اور مدت تک خلافت کمیٹی کے سکریٹری رہے ۲۴ء میں جو مشہور وفد خلافت حجاز گیا اس کے بھی سکریٹری تھے اور پھر دوبارہ جو دوسرا وفد مولانا ظفر علی خاں کی قیادت میں گیا اس میں بھی شریک تھے اور وہیں ان سے اور صدر وفد سے اختلافات نمایاں ہوگئے۔ زمانہ ان کی شہرت کے شباب کا تھا بچہ بچہ کی زبان پران کا نام تھا بڑے پختہ بلکہ کہنا چاہیے کہ گرم قسم کے مسلمان تھے۔ کانگرس میں بھی بہت مقبول تھے اور جواہر لال نہرو کے دوستوں میں شامل اکتوبر ۲۸ء میں جب نہرو رپورٹ شائع ہوئی۔ تو یہ اس سے اختلاف کر کے کانگرس ہی سے علاحدہ ہوگئے۔ نواب صاحب بھوپال ان پر مہربان ہوئے اور انھیں وزیر ریاست معزز کر کے عالی مرتبت مشیر المہام بنادیا گیا۔ اب یہ رئیس تھے سن اچھا خاصا آچکا تھا اور اب تک شادی نہ ہوسکی تھی۔ پاکبازی میں ممتاز آخر دوستوں کی رائے سے مولانا محمد علیؒ کی چھوٹی صاحبزادی سے عقد کی ٹھہری اور جون ۱۹۳۰ء میں عقد ہوگیا۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم دولھا والے بنے تھے اور بارات انھیں کی کوٹھی سے عبدالرحمٰن صدیقی کے اہتمام میں قرول باغ پہونچی۔

قیام پاکستان کے زبردست حامیوں میں تھے اور پاکستان بنتے ہی ہجرت کر گئے وہاں یقدر ہوئی کہ مرکزی وزارت میں لے لئے گئے اور وہاں سے ہٹنے کے بعد عراق میں سفیر اور سندھ میں ہائی کمشنر رہے ـــــ گردش تقدیر ایک بار پھر رنگ لائی اور یہ عہدہ ومنصب سے الگ ہو کر گمنامی وگوشہ نشینی کی زندگی پر مجبور ہوگئے۔ رفیق حیات کا بھی انتقال ہوگیا جوانی میں تندرستی رعنائی وشادابی کے لئے ضرب المثل تھے اب ضعف وناتوانی سے ٹوٹ کر ہر وقت وقت موعود کے انتظار میں رہنے لگے۔ لفٹنٹ کرنل خواجہ عبدالرشید ڈائرکٹر سنٹرل ملٹری نے ۱۲ر فروری کے خط میں مجھے لکھا۔

"کل صبح شعیب قریشی صاحب سے ملنے گیا علی الصباح کوئی ساڑھے سات بجے۔ رات بھر یہی سنتے رہے کہ چند لمحوں کے مہمان ہیں ان کے داماد میر معتز بھی سے تے میں بڑی پریشانی رہی بہت دنوں سے دیکھا بھی نہیں تھا اسپتال ہی میں

ہیں۔ کمرے میں گیا تو دروازے ہی سے پہچان لیا۔ انھیں دیکھ کر طبیعت بہت پریشان ہوئی۔ بس ڈھانچہ ہی رہ گیا مگر انھوں نے خوب پہچانا اور خوب باتیں کیں۔ ہوش وحواس مکمل قائم، ہاتھ جو بڑھایا ملانے کو تو برابر پکڑے رکھا جب تک میں نے خود نہیں ہٹایا۔ پنجے میں گرفت بھی اچھی خاصی تھی اور آتے وقت وہ خدا حافظ بھی نہیں کہتی کہ احتمال ہو تا کہ بس آخری دم ہے۔ بڑے گردے کے انسان ثابت ہوئے خوب خوب جنگ کی ہے انھوں نے بیماری سے۔
دو آپریشن بلکہ یوں کہیے آپریشن پر آپریشن ہوئے۔ اور برداشت کر گئے ہیں۔ اب دیکھیے کہاں تک اور لڑائی کرتے ہیں ان کی خدمت بھی خوب ہوئی ہے ان کے داماد خود سرجن ہیں اللہ تعالیٰ انھیں شفا دے :

اسی کے چار ہی دن بعد ۲۶ فروری کو یہ بہادر مسلمان رخصت ہو گیا۔ رمضان کا مبارک دن پایا اور اسی کی ۹ تاریخ۔

جسٹس سید محمود (فرزند سرسید) کی اچانک وفات پر اکبر نے جو قطعہ کہا تھا بے موقع نہ ہوگا اگر اسے ایک بار پھر سامنے لایا جائے ؎

نہ وہ بک گئے نہ سر سید | دل احباب سے نکلتی ہے آہ
ذات محمود سے تسلی تھی | لی انھوں نے بھی آج خلد کی راہ
بولی عبرت کہ ہوش میں آؤ | اے حریصان شان و شوکت و جاہ
مٹ گیا نقش احمد و محمود | رہ گیا لا الٰہ الا اللہ

ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم

ذاتی زندگی کی چند جھلکیاں

سنہ ۱۹۲۶ء ہے اور خلافت کمیٹی کا زور اس وقت تک بالکل ٹوٹا نہیں ہے مرکز
خلافت کمیٹی کی میٹنگ دہلی میں ہو رہی ہے میں شرکت کو گیا وہیں جلسہ کے باہر ایک جوان
تندرست وجیہہ جوان کو دیکھا سفید براق کھدری شیروانی میں ملبوس سر پہ دیسی
ستھری گاندھی ٹوپی چہرہ پر اچھی خاصی اور خوشنما سیاہ داڑھی جامعہ ملیہ والے سعید انص
(جواب ڈاکٹر سعید انصاری) کے ساتھ انھوں نے متعارف کرایا کہ تازہ ترین جرمن پلٹ
ذاکر حسین خاں یہی ہیں اچھا وہی ڈاکٹر جن کی ذہانت واخلاص و دلولے کے چرچے
دلوں سے سننے میں آ رہے تھے جی ہاں۔ شخصی تعارف یوں ہوا اور کچھ ہی دیر میں
باطن کا ایک جلوہ نظر آ گیا جو بیرونی حضرات کمیٹی کے ممبروں سے اتنا قریب بیٹھے تھے کہ
کی ساری کارروائیاں ان پر ظاہر ہو رہی تھیں اور یہ بات آداب جلسہ کے کھلے ہوئی خلاف
تھی مولانا محمد علی نے پکار کر کہا آپ لوگ براہ کرم اپنی جگہ چھوڑ دیں ڈاکٹر صاحب
ملیہ کے ہونے والے پرنسپل بخوشی اس پر رضامند ہو گئے اور وہ جگہ چھوڑ کر اٹھ کھڑے
حالانکہ ان کے جونیر ساتھی اس میں اپنی توہین سمجھے اور انھیں روکتے رہے۔ ڈسپلن
پابندی کی ایسی مثال ہم لوگوں میں شاذ ملتی ہے اور یہ تو اس پہلی ملاقات

صدق جدید ۱۲ مئی ۱۹۶۹ء

رح متاثر ہوا۔

سـ۳۳ء تھا کہ مولانا سلیمان ندوی کے ہمراہ دریاآباد گئے اور دن بھر قیام کیا جامعہ
یری کی پرنسپل خود ایک معزز عہدہ سے کسی صورت سے معلوم نہیں ہوتا تھا کہ یہ بھی کوئی او نچے
ہدہ دار ہیں اٹھنے بیٹھنے بات چیت ہر طرح سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ کوئی خدمت گار
یش کار ہیں یہاں کے ایک آدھ دیہاتی ٹیچر سے ملے اور ان سے کام کی باتیں کرتے رہے
قسم کے مشورے دیتے رہے کہ رہنے سہنے میں صفائی کا چلن چلائیے اسکول سے خالی
قات میں محلہ کی سڑکوں کی صفائی کا کام کیجئے کام اپنے ہاتھ سے کرتے رہتے محض بتاہی نہیں
نہ والوں کا بھی۔ دلّی جاکر جامعہ میں بھی ملنا ہوا ہے جب ملے تو بالکل خُرد بن کر۔ جامعہ اور مطبوعات
ہ کے سلسلہ میں سچ رصدق کا پرانا نام انے دعبارہ نکتہ چینی بھی کی کبھی اس سے کبیدہ د
زردہ نہ ہوئے تحریر میں خود صفائی پیش کی اور جب ملے تو سابق خندہ روئی سے کھانے کا
ت آگیا تو اپنے ساتھ کھانا بھی کھلایا اس نے دعوت شیراز کا لطف دیا، سادگی کے ساتھ
غائی تو خاص ان کا جوہر ہی تھا۔

شـ۲۵ تھا یا اور کوئی سن علی گڑھ میں کوئی بہت بڑا جلسہ تھا کالج یا کانفرنس دونوں میں
ہاں کی جوبلی تھا ں کئی دن ان کا ساتھ رہا صدر یار جنگ مولوی حبیب الرحمٰن خاں شیروانی
وم و مغفور سے مخدوم و مکرم تھے لیکن اس وقت انھیں کی کسی بات پر ان سے شکر رنجی ہو
ئی اور میں نے ان کے ہاں جانے سے انکار کر دیا انھیں خبر ہوئی تو باوجود اس کے کہ ان سے
ور حوم سے سیاسی اختلاف تھا مجھے سمجھایا بجھایا منایا اور بالآخر ان کے ہاں بھیجکر چھوڑا۔
الف پارٹی والے کے ساتھ اس مدارات و ملاطفت کا برتاؤ کہاں دیکھنے میں آتا ہے
ر شرافت تھے ـــ انگریزوں کو بُرا بھلا کہنا فیشن میں داخل تھا اور سخت ترین الفاظ

اچھے اچھوں کی زبان پر چڑھے رہتے تھے ڈاکٹر ذاکر باوجود اپنی معروف و معلوم حریت آگیں کے اس سے مستثنیٰ تھے نرم سے نرم تاویلیں ان کے افعال و اعمال کی کیا کرتے۔

سنہ ۱۹۴۸ء تھا یہ تے نئے وائس چانسلر علی گڑھ کے مقرر ہوئے تھے ان کی صدارت میں پہلا جلسہ یونیورسٹی کورٹ کا تھا عبدالمجید خواجہ بیرسٹر اور پرانے نیشنلسٹ بھی شریک جلسہ تھے جب میٹنگ ختم ہوئی لوگ چلنے لگے تو خواجہ صاحب نے ناخوشی کے لہجہ میں سب کے سامنے کہا۔ ذاکر صاحب اگر آپ سمجھتے ہیں جلسہ بہت کامیاب ہوا تو ایسا ہرگز نہیں ہے۔ کوئی دوسرا ہوتا تو اس پر بگڑ جاتا مگر یہ ذرا بھی نہ بگڑے خوددارانہ انداز سے اور نرم لہجہ میں ان سے کہتے ساتھ چلے جا رہے تھے جی نہیں میں ہرگز نہیں سمجھتا کہ جلسہ مثالی طور پر کامیاب رہا۔ ایسی شرافت کی مثالیں پبلک زندگی میں کم ہی نظر آئیں گی۔

۱۹۴۹ء ہوگا کہ کورٹ کی ایک اور میٹنگ دوپہر کے لنچ کے لئے برخاست ہوئی اب کی میٹنگ یونین عمارت میں نہیں بلکہ یونیورسٹی کے مہمان خانہ میں تھی خیال آیا کہ نماز یہاں کون پڑھے گا' دیکھتا کیا ہوں کہ ایک صاحب بغیر شیروانی کے محض ایک کرتہ پہنے لوٹا ہاتھ میں لئے ہوئے غسل خانہ وضو کے لئے جا رہے ہیں' دیکھا تو خود وائس چانسلر تھے اور جب وہ آکر جانماز پر بیٹھ گئے تو دیکھا دیکھی کچھ ہم اور بھی آگئے' نماز کے تو اس وقت پورے پابند تھے اور روزے کے بھی اور حج اس کے چند سال بعد جا کر لیے زمانہ نائب صدارت میں کر آئے ذکر ان کے عام انسانی اخلاق و عادات کا ہو رہا تھا ضمناً ان کی عبادت بھی آگئی۔

سال اب یاد نہیں بہر حال ان کی جامعہ کی پرنسپلی کا زمانہ تھا یونیورسٹی کورٹ کی میٹنگ میں وہ دلی سے آئے اور میں دریاباد سے پہنچا رشید صدیقی کے یہاں ہم دونوں اترے ان کا کمرہ میرے کمرے سے متصل تھا فجر میں ابھی خاصا وقت باقی تھا کہ آہٹ محسوس ہوئی دیکھا تو ڈاکٹر صاحب غسلخانہ سے وضو کر کے باہر آچکے ہیں اور جانماز پر بیٹھے کوئی دعا

کرتے ہیں۔ شاہ طالب حسین فرخ آبادی کے مرید عرصے سے ہو چکے تھے۔ میں نے خود انھیں تہجد پڑھتے نہیں دیکھا لیکن عجب نہیں کہ پھر بھی عمر کے اس دور تک وہ تہجد کے پابند رہے ہوں۔ اس کے بعد میں تنہا نماز با جماعت فجر کے لئے روانہ ہو گئے۔ قرآن مجید کی عظمت بھی اس حد تک اچھی خاصی ان پر غالب تھی۔ جامعہ کے کوئی صاحب اعلا تعلیم کے لئے یورپ جا رہے تھے ڈاکٹر صاحب نے وداعی تقریب میں چلتے وقت انھیں ایک چھوٹے سائز کی کتاب پیش کی اور کہا یہ کتاب آڑے وقتوں آپ کی مدد کرے گی جیسی کہ آپ سے قبل بہتوں کی کر چکی ہے اور یہ کتاب قرآن کی ایک حمائل تھی۔ ان کے خاص فن تعلیمات اور معاشیات تھے اور ساتھ ہی فلسفہ کا مطالعہ بھی وسیع تھا۔ افلاطون کی کتاب جمہوریت کے مترجم تھے لیکن دوسری طرف تفسیر قرآن سے بھی انسیت رکھتے تھے تفسیر ماجدی جلد اول شوق سے دل لگا کر پڑھی اور دوسری جلد کی طباعت اور اشاعت کے لئے ایک ہزار کی رقم اپنی طرف سے پیش کی گو کہ میں اسے قبول نہ کر سکا۔

سنہ غالباً ۵۸ء تھا، وہ بہار کے گورنر تھے میں پٹنہ جانے لگا تو اپنے یہاں ٹھہرنے کی فرمائش کی اسٹیشن جو موٹر میرے لئے آیا وہ عجیب طرح کا تھا یعنی بالکل بند اور شیشوں پر کپڑا بندھا ہوا۔ اے ڈی سی صاحب نے بتایا کہ یہ موٹر سرکاری نہیں ڈاکٹر صاحب کا ذاتی اور ان کی ملک ہے۔ مرحوم سرکاری چیزوں سے کام لینے میں ایسے ہی احتیاط برتتے تھے، میری خدمت کے لئے جو ملازم صاحب متعین تھے وہ بھی ان کے ذاتی ملازم دیانت، اسحاق، تھے کوئی سرکاری چپراسی میرے قریب نہ آ پاتا تھا۔ یہ معیار ان کی دیانت کا تھا میرے پہونچنے کے تھوڑی ہی دیر بعد میرے کمرے میں آئے اور مجھ سے نہیں میرے ساتھ کے ملازم سے پوچھا، آپ (رتم نہیں)، کھانا کھا چکے ہیں اب آرام سے سویئے۔ ملازم صاحب کی آنکھیں گورنر صاحب کے اس التفات کو دیکھ کر کھلی رہ گئیں جب تک میرا قیام وہاں رہا وہ میری مرتب

اسلامی اخلاص وآداب کے ساتھ ادا کرتے رہے، ان کی نائب صدارت کے زمانہ میں دو چار دن جانا ہوا اور انھیں کے ہاں ٹھہرنا ہوا، روزانہ صبح سویرے پیدل ٹہلنے کے لئے روانہ ہو جاتے واپسی پر سیدھے میرے کمرے میں آتے، دریں اثنا میں میری چائے آچکی ہوتی میرے پاس کچھ دیر بیٹھ کر اور میری خیریت دریافت کر کے اندر جاتے۔ دہلی کے انگریزی روزنامے اس وقت تک آچکے ہوتے، حکم تھا کہ سب سے پہلے میرے پاس آئیں اور جتنی دیر بھی چاہوں انھیں رکھ کر انھیں واپس کردوں جب جا کر خود پڑھتے کھانا اکثر و بیشتر اپنے ساتھ ہی اسی میز پر کھلاتے، سلام میں ہمیشہ خود ہی سبقت کرتے۔

خط و کتابت بلا ضرورت نہ کرتے پھر بھی سال میں اوسطاً دو چار خطوط تو آہی جاتے میرے پاس تقریباً ۲۰ خط محفوظ ہوں گے۔

سنہ۲۳ء سے سنہ۶۹ء تک ۴۶ سال کے تعلقات کی مدت کم نہیں ہوتی، ذاتی کردار کی جھلکیاں آپ نے دیکھ لیں، رہی پبلک زندگی سو اس میں ہر بڑی شخصیت کی طرح بڑی گنجائش قیل و قال کی ہے اس پر فوراً کوئی تبصرہ مناسب نہیں جب کہ مرحوم کے عزیزوں (بھائیوں لڑکیوں، نواسیوں وغیرہ) کے دل اتنے دکھے ہوئے خصوصاً آپ کی حرم محترم اور تازہ بیوہ جن کی بادشاہی پلک جھپکاتے اپنے لفظی معنی ہی میں لٹ گئی ہے اور جو پہلی ہی عابدہ زاہدہ اور سخت قسم کی پردہ نشین اور شوہر کی خدمت میں آخر وقت تک رہنے والی درویش صفت صاحب ایمان خاتون ہیں اس وقت اس بوڑھے کی دعا بس یہ ہے کہ اللہ آمرزگاروں کی لغزشوں کو (اور لغزشیں انبیا معصوم کے سوا اور کس سے نہیں ہوتی ہیں) معاف فرمائے اور حشر میں ان کو نصیب ور کرے مرحوم نے سالہا سال سے نماز جمعہ ترک کردی تھی، خیال یہ ہوتا کہ ایسا شاید اعلا عہدہ کی بنا پر اپنی جان کے خطرے کے خیال سے ہے مگر خود مرحوم نے ایک صاحب سے بیان فرمایا کہ میرے گھٹنوں میں سخت تکلیف رہتی ہے جس سے دوزانو

بیٹھنا التحیات کے لئے ممکن نہیں گھر پر نماز چوکی پر پیر لٹکا کر پڑھ لینا ہوں، مسجد میں یہ صورت کہاں ممکن؟ اللہ ایسا کرے کہ ان کے ہر قابل اعتراض عمل پر ایسی ہی توجیہ دنیا دل حشر میں نکال بندے تو صرف ظاہری عمل کو دیکھتے ہیں باقی فاعل کی نیت اور اس کی مجبوریوں اور معذوریوں کا علم کس کو؟ ہزارہا بلکہ لاکھوں مسلمانوں کی مخلصانہ دعائیں بڑے مجمع کے ساتھ جنازے کی نمازیں اور بے شمار قرآن خوانیاں ہرگز ضائع ہونے والی چیز نہیں.

چودھری خلیق الزماں مرحوم

فروری ۴۶ء کی کوئی ۱۳ تاریخ ہے، یوپی اسمبلی کے الکشنوں کا زمانہ ہے آج چودھری خلیق الزماں کے الکشن کا دن ہے، مسلم لیگ کے وقار وعزت کے امتحان کا دن ہے، چودھری کا کہنا چاہیے کہ صوبہ مسلم لیگ کی خدائی یا ناخدائی کر رہے تھے، حریفوں نے اپنی پوری قوت آج اس مقابلہ پر لگادی ہے۔ کانگریس تو خیر مخالف تھی ہی سنی بورڈ نے امیدوار کھڑا کر کے بہت سے ووٹ اہل سنت کے ادھر نکال لئے ہیں۔ اور ایک شیعہ امیدوار بھی میدان میں ہے چودھری صاحب سالہا سال سے لکھنؤ میونسپل بورڈ کے صدر رہ چکے تھے، جتنے مخالف اس سلسلہ کے تھے سب کی آج بن آئی ہے۔ کئی دن سے خوب مظاہرے ہو رہے ہیں اور جلوس پر جلوس مخالفانہ نعرے لگاتے ہوئے نکل رہے ہیں چھوٹے اور بڑے جتنے ذاتی اور قومی کسی سبب سے بھی چودھری صاحب سے کوئی رنج دل میں رکھتے تھے آج سب ہی دل کے حوصلے نکال رہے تھے اور ان کے ہرانے پر ادھار کھائے بیٹھے تھے —— پھر چودھری صاحب آخر اس کا کچھ توڑ نہیں کرتے، ان کے حامیوں کا جلوس کیوں نہیں نکلتا؟ ایک جلوس کو چھوڑ کر، وہ

صدق جدید یکم جون ۱۹۴۶ء

نہ تو اپنے موافقوں کا جلوس نکلواتے ہیں نہ اپنے معتقدوں اور ہمدردوں کو اس کی اجازت دیتے ہیں۔ اور ملت کے ووٹروں پر بھی اعتماد کیے بیٹھے ہیں اور کہتے ہیں کہ مسلمان اب دوست دشمن کو خوب اچھی طرح پہچان گیا ہے، مجھے کسی جلوس وغیرہ کی کیا ضرورت۔ نتیجہ نکلا تو خود دنیا نے دیکھ لیا کہ انھیں کا اندازہ صحیح نکلا۔ مخالف بُری طرح ہارے اور جھنڈا لیگ ہی کا بلند رہا!

یہ تھے چودھری خلیق الزماں جن کی پبلک زندگی کی ایک ہلکی سی جھلک آپ نے دیکھ لی۔

بیسویں صدی کے پہلے دہے کا کوئی سنہ ہے چودھری صاحب کی والدہ اپنے ایک بڑے لڑکے کی شادی کی تاریخ مقرر کر رہی ہیں۔ منگنی اپنی سگی بھانجی کے ساتھ مدت ہوئی ٹھہر چکی ہیں۔ عین وقت پر معلوم ہوا کہ صاحبزادے وہاں نکاح کرنے پر آمادہ نہیں، لڑکی کی صورت و سیرت میں کچھ عیب نکال کر نکاح سے سرے سے انکار کر رہے ہیں ——

"ارے یہ تو بڑے غضب کی بات ہوئی، سوچ رہی تھی کہ اپنی سگی بھانجی کو گھر کی بہو بناؤں گی۔ برادری بھر میں کیسی ناک کٹ رہی ہے۔ کتنی بڑی بدنامی ماں باپ کی ہو رہی ہے"!

گھر میں رونا پیٹنا پڑ گیا۔ اس گھڑی چھوٹے بھائی نمودار ہوتے ہیں۔ ماں کے پاس آکر کہتے ہیں کہ امی جان آپ دل نہ میلا کیجیے، بھائی جان نے اگر انکار کر دیا تو میں حاضر ہوں، لڑکی جیسی کچھ ہے ظاہر ہے لیکن آپ کی بات جا رہی ہے، میں یہ کیسے دیکھ سکتا ہوں عقد کر لوں گا دل پر تو اختیار نہیں البتہ جہاں تک ظاہری برتاؤ کا تعلق ہے میں شادی ساری عمر نباہ دوں گا خرچ وغیرہ برابر دیتا رہوں گا اور آگے چل کر آپ کی ایک دوسری بہو اپنی مرضی کے مطابق لانے کی اجازت آپ سے لینا ہوگی"! ماں اس سعادت مندی سے باغ باغ ہو گئیں، سوکھی کھیتی میں پانی پڑا تقریب ہنسی خوشی ہو گئی اور ساری عمر نباہ ہو گیا۔ اولاد بھی ان بیوی سے ہوئی۔ ان

بیوی کا چند سال ہوئے ان کا سنہ (سنہ) میں انتقال ہو گیا۔ دو لڑکیاں بیاہ ہو کر ہندوستان میں رہیں۔

انھیں اماں کا جب آخری وقت آیا تو دیکھنے والوں نے دیکھا کہ چودھری صاحب پاکستان سے جب انھیں دیکھنے آئے تو ان کے پاؤں داب رہے ہیں۔

یہ ایک دوسری ہلکی سی جھلک چودھری صاحب کی خانگی اور نجی زندگی کی تھی۔

یہ دو نمونے چودھری صاحب کی ساری زندگی کے آئینہ دار ہیں تفصیل جو کچھ بھی جو کوئی لکھے گا وہ اسی متن کی شرح ہوگی ——— میرے عزیز تھے اور کچھ ایسے دور کے نہیں میری والدہ ان کے والد کی حقیقی زاد بہن تھیں۔ اصل وطن شہر لکھنؤ سے متصل قصبہ بجنور کا موضع چلاآدان تھا۔ نسب کے بڑے کھرے شیخ صدیقی تھے، اودھ کی سلطنت قائم ہونے سے بیشتر یہی شیخ زادے یہاں عملاً حکمراں تھے۔ ان کا قبرستان جہاں ان کے مورث اول شیخ عبدالرحیم بھی مدفون ہیں، اور ان محل روڈ لکھنؤ میں اس وقت بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ ہم لوگ نسباً قدوائی ہیں، لکھنؤ کے ان شیخ زادوں اور بانسہ کے سادات سے قرابتیں قائم کر کے قدوائیوں کا نسب بھی معیاری بن گیا۔ سن میں مجھ سے تین ساڑھے تین سال بڑے تھے، پیدائش ۱۸۸۹ء کی تھی اسکولی تعلیم لکھنؤ کے کوئنس اسکول میں پائی۔ کھیل میں بہت اچھے تھے، اور ذہین طباع اور شوخ مزاج۔ کالج میں تعلیم کیلئے علی گڑھ گئے۔ اور بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی کی ڈگریاں وہیں سے لیں۔ غالباً ۱۹۱۲ء میں سیاسی زندگی کا آغاز کر دیا تھا۔ ابھی پڑھ ہی رہے تھے کہ جنگ طرابلس کے بعد جنگ بلقان خلیفۃ المسلمین سلطان ترکی سے شروع ہو گئی اور علی گڑھ کے طلبہ میں گویا زلزلہ آگیا۔ مولانا محمد علی کا انگریزی ہفتہ وار کامریڈ کلکتہ سے دہلی آ گیا تھا اور اپنے شباب پر تھا۔ مولانا نے طبی وفد ترکی زخمیوں کی دیکھ بھال کیلئے ڈاکٹر انصاری کی سرکردگی میں ترکی بھیجا۔ اس میں جو شوق سے والنٹیر بنے ان میں ایک چودھری صاحب بھی تھے، شعیب قریشی، عبدالرحمن صاحب وغیرہ سے گہری دوستی اسی سلسلہ میں

اس سے پیدا ہوئی۔

حقیقی ماموں لکھنؤ کے مشہور وکیل حاجی محمد نسیم مرحوم تھے، تعلیم و تربیت انھیں نے
دلوائی اور بطور جونیر وکیل کے اپنے ساتھ رکھا۔ ان کے لڑکے محمد وسیم مرحوم اور ان کے ماموں
زاد بھائی ہونے کے علاوہ ان کے بہنوئی بھی تھے، لکھنؤ کے مشہور بیرسٹر تھے پاکستان بنتے
ہی وہاں منتقل ہو گئے اور ایڈوکیٹ جنرل ہو گئے۔

سیاسی عقیدت علی برادران سے رکھتے تھے، مولانا محمد علی کے خصوصی عقیدت مند
بس چند تھے۔ ان کے دو گروہ تھے، پہلے گروہ میں عبدالمجید خواجہ، ڈاکٹر سید محمود، تصدق احمد خاں
شروانی (اور ایک زمانہ تک) ڈاکٹر ناظر الدین حسن تھے۔ اور دوسری ٹولی میں ولایت علی (بمبوق
مرحوم) شعیب قریشی اور عبدالعزیز انصاری کے ساتھ چودھری صاحب بطور سرگروہ تھے
اور جو سبق جمال الدین افغانی اور اقبال وغیرہ نے اتحاد اسلامی کا دیا تھا اسی راگ کے مغنی
مغنی تھے ———— ملکی سیاست میں گاندھی جی کے بعد سب سے زیادہ متاثر پنڈت موتی لال
نہرو سے تھے، اور جواہر لال نہرو بقول شخصے اپنا لنگوٹیا یار سمجھتے تھے۔ خلافت ترک موالات کے
دوران میں صوبہ کی کمان انھیں کے ہاتھ میں تھی، اور فرنگی محل میں کبھی مل کر اور کبھی الگ ہو کر خلافت
کمیٹیاں وہی بناتے اور بگاڑتے رہے۔ برسوں کانگریس میں شریک رہے جبکہ صوبہ ہی
میں ایک فرد کانگریس کا ڈکٹیٹر ہوا کرتا تھا وہ اس کے ڈکٹیٹر بھی رہے تھے، اس کے بعد مسلم
لیگ میں آئے۔ پاکستان کا سلسلہ اس بلند آہنگی سے کیا کہ گویا جناح صاحب کے بعد انھیں کا نمبر تھا
غالی مسلم لیگی ہونے کے باوجود ذاتی تعلقات ہندو دوستوں سے برابر باقی رہے، سر تیج بہادر سپرو،
سر کرشنا ناتھ مسرا، پیشکر ناتھ سیٹھ وغیرہ سے تعلقات ویسے ہی رہے جیسے پہلے کسی زمانہ میں تھے
لکھنؤ میونسپل بورڈ کے صدر متعدد بار ہوئے، کسی مسلمان کیلئے ایک ہی بار ہونا ایک بڑا اعزاز
تھا یہ جائیکہ بار بار ہونا۔ سنی وقف بورڈ کے صدر رہے۔ اپنی ابتدائی زندگی میں مہاراجہ محمود آباد
کے پرائیوٹ سکریٹری بھی کچھ دن رہے تھے۔

لکھنؤ میں جو چند مسلم گھرانے بطور مستقل مہمان سرا کا کام دیتے تھے ان میں علاوہ مولانا عبدالباری فرنگی محلی، مہاراجہ محمود آباد، مولوی محمد نسیم مرحوم کے ڈالی باغ کی ایک گھران کا بھی خیابان گنج میں ——— اور یہ گھر سیاست دانوں کا مرکز تھا، مسلمانوں کی قسمت کے بگڑنے کے فیصلے وہیں سے ہوتے رہتے تھے۔۔

جلسہ میں نعرۂ تکبیر کی کثرت ان کے جلسوں کی خصوصیت تھی۔ آہ کہ ۱۹۴۷ء کے بعد سے ان کے سننے کی حسرت سیاسی جلسوں میں رہ گئی۔ (حاجیوں کی روانگی اور واپسی کے قافلوں کے ساتھ ان کا بلند ہونا بالکل الگ ہے)

پاکستان کے قیام کے بعد اعلان یہ ہوا تھا کہ جناح صاحب انھیں کو ہندی مسلمانوں کی رہبری اور رہنمائی کیلئے ہندوستان میں چھوڑ گئے ہیں، لیکن مسلمانوں کی قسمت میں کوئی تعمیری پروگرام اب کہاں تھا۔ انھیں بھی جلدی ہندوستان چھوڑنا پڑا۔ اپنی ہجرت کے اسباب تفصیل سے اپنی انگریزی کتاب PATHWAY TO PAKISTAN میں اور اس سے بھی زیادہ شرح و بسط کے ساتھ اردو کتاب شاہراہ پاکستان میں لکھ دیئے ہیں دستیاب ہو سکے تو اسے ضرور پڑھئے

چودھری صاحب کی بے شمار تقریروں میں سے صرف ایک ذرا سا فقرہ یاد رہ گیا ہے اپنی قیادت کے زمانہ میں لکھنؤ کی پبلک کے سامنے ایک بار کہا تھا کہ: —

"آپ کو روز گرم پیالی چاہیئے، میں ہر روز گرم پیالی آپ کو کب تک پلایا کروں"۔

پاکستان پہنچ کر ان کی کچھ زیادہ قدر نہ ہوئی، کچھ دنوں پاکستان مسلم لیگ کی تنظیم کرتے رہے پھر خود لیگ ہی کے کچھ دن کے بعد لالے پڑ گئے تھے، خدا معلوم کتنی پارٹیاں وہاں نکل پڑیں۔ حکومت کی طرف سے ایک بار انڈونیشیا میں سفیر ہو کر گئے تھے، اور ایک بار مشرقی پاکستان کے گورنر ہو لئے تھے، جناح صاحب سے تعلقات اچھے نہیں باقی رہ گئے تھے۔ ہندوستان جب آجاتے تھے تو ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے۔ پنڈت نہرو اور پنت جی بہت بڑھ کر ملتے ——— جس زمانہ میں مشرقی پاکستان کے گورنر تھے ایک بار ہوائی جہاز سے دہلی سے گزر رہے تھے، اخبار والا

میں تصویر آئی کہ یہ کھڑے ہوئے ہیں اور استقبال کیلئے رفیع احمد قدوائی مرکزی وزیر موجود ہیں، دونوں کے تعلقات سے جو واقف تھا اسکے لئے تصویر مرقع حسرت تھی۔ کل تک جو جگری دوست تھے فکر و عمل دونوں میں ہم رنگ و ہم آہنگ۔ قرابتوں کی زنجیروں میں بھی جکڑے ہوئے تھے آج ایک دوسرے سے بیگانے ہی ہیں، غیروں اور بیگانوں کی نہیں بلکہ دشمنوں کی نظر سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے، ہند اور پاکستان کہاں کے دوست اور کیسے پڑوسی، یہ معلوم ہوتا

ہے کہ ایک دوسرے کے دشمن کئی پشتوں سے چلے آرہے ہیں، خیر یہ منزل بھی جھیلنا دونوں کی قسمت میں تھا۔

مسلمان ہمیشہ سے رہے، اور مربی و سرپرست ماموں حاجی محمد نسیم مرحوم کی دینداری اور مذہبیت تو ضرب المثل تھی۔ والدہ ماجدہ بھی دینداری میں شہرت رکھتی تھیں ان کے ساتھ ساتھ مذہبیت میں بھی ترقی ہوتی رہی، عمر کے آخری ۱۰-۱۲ برسوں میں مرحوم نماز اور تلاوت قرآن کے شدت سے پابند ہو گئے تھے، مجھ بیچمداں کی تفسیر کی بڑی ہی قدر افزائی کرتے رہے، خط کبھی کبھی آتے ان میں یہ مضمون بھی ہوتا کہ تمہاری تفسیر بار بار پڑھ رہا ہوں اور بڑی حسرت یہ ہو رہی ہے کہ سیاست میں پڑ کر اپنی عمر ضائع کر دی، کاش تمہاری طرح دینی خدمت میں لگ جاتا!

پاکستان کی خستہ حالی اور زبوں بختی سے نہایت درجہ غمگین اور افسردہ رہتے، اپنی ساری کھیتی کو اجڑتے اور سوکھتے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے، ہفتوں بلکہ مہینوں سے مسلوب الحواس سے ہو رہے تھے، آخر میں حافظہ بڑی حد تک جواب دے گیا تھا بہاری چیزیں بھول گئے تھے، جب نوبت آکسیجن سے سانس لینے کی آگئی تو شاید ہماری وزیر اعظم صاحبہ نے خاندانی تعلقات کا خیال کرتے ہوئے ان کی دونوں بیاہی ہوئی لڑکیوں کو کراچی جانے کی اجازت دے دی تھی لیکن بعض اتفاقات کے باعث یہ دونوں انتقال کے بعد ہی وہاں پہنچ سکیں، اس سے قبل ملت کا یہ خادم جمعہ کے دن اپنے مولا کے حضور میں حاضر ہو گیا

ڈاکٹر سمپورنانند آنجہانی

۱۰ جنوری کو خبر آئی کہ یو۔پی کے مشہور بلکہ آل انڈیا شہرت پائے ہوئے ڈاکٹر سمپورنانند رحلت کر گئے۔ عرصہ دراز سے اپنے وطن بنارس میں بیمار چلے آرہے تھے یو۔پی میں کئی سال تک وزیر تعلیم رہے اور پھر پنت جی کے مرکز چلے جانے پر بجائے حافظ محمد ابراہیم کے وزیر اعلیٰ بھی ہو گئے، اس سے استعفا دینے کے بعد راجستھان کے گورنر مقرر ہو گئے اور مدتوں اسی عہدہ پر رہے۔ کاشی ودیا پیٹھ کے وائس چانسلر تھے ہندی کے نامور ادیب تھے انگریزی میں بھی درک رکھنے کے علاوہ فرانسیسی اور سنسکرت سے بھی واقف تھے اور فارسی اُردو پر بھی قدرت رکھتے تھے۔ اُردو سے متعلق ان کا جو مسلک تھا وہ سب کو معلوم ہے

منقول از صدق جدید ۲۴ جنوری ۱۹۶۹ء

اس کے باوجود اُردو سے دلچسپی اور واقفیت دونوں خوب رکھتے تھے اور مشاعرے خوب کرتے تھے اور بعض مشاعروں میں غزل بھی آنند کے تخلص کے ساتھ سناتے تھے غزل کا مضمون عاشقانہ نہیں صوفیانہ ہوتا تھا خصوصاً وحدت الوجود کا ـــــ مغربی فلسفہ بہ وفلسفہ اور فن جوتش میں بھی خاصہ درک تھا۔ آخر برسوں میں کئی سال تک ہندی کمیٹی کے صدر رہے جس کی ایک شاخ اُردو کی بھی تھی۔ اس کمیٹی کا ایک ممبر مدیر صدق جدید بھی تھا سے جب ان سے مراسلت کی ضرورت پڑتی تو وہ خط اردو میں لکھتا اس کا جواب بھی وہ پابندی کے ساتھ اُردو ہی میں دیتے اور اردو مصنفین کے سرکاری انعام واکرام کے معاملہ میں بھی کسی بخل یا ناانصافی سے کام نہ لیتے۔ بہ حیثیت سرکاری مہمان کے بھی جب جب جے پور گورنمنٹ گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرنے کا اتفاق ہوا انھوں نے کوئی فرق نہ آر دو ہندی والوں میں آنے دیا اور نہ ہندو مسلم مہمانوں کی خاطر داریوں میں ـــــ علم جوتش میں بھی خاص دخل تھا۔ اور سنا ہے کہ ملازمت وغیرہ کے سلسلہ میں جب کسی مسلمان کا معاملہ آپڑتا تو پورے ضابطہ کا برتاؤ رکھتے اور کسی تعصب مذہبی کو راہ میں نہ حائل ہونے دیتے۔ عمر کچھ کم ۸۰ سال کی پائی۔

سکندر حیات

○

سر سکندر حیات خاں مرحوم کی ختم حیات کی خبر آپ نے اخبارات میں پڑھ لی ؟ ماتم کی صدائیں ملک بھر میں گونجیں، وہ بھی سُن لیں ؟ صوبہ اور پنجاب جیسے زبردست صوبہ کے وزیر اعلیٰ تھے اپنے اثر و اقتدار کے لحاظ سے سارے ہمعصروں سے بڑھ چڑھ کر تدبر و فرزانگی میں لاجواب سوجھ بوجھ، فہم و دانش میں اپنی نظیر آپ۔ عملاً وزیر نہیں، تاجدار تھے۔ نائب نہیں، خود مختار تھے۔ ماتحت نہیں سالار تھے بڑھ چکے تھے۔ بڑھ رہے تھے اور خود تو بڑھ ہی رہے تھے اوروں کو بھی بڑھا رہے تھے۔ اچانک اور حسرتناک موت کی خبر سننے کے لئے دوست دشمن کوئی بھی تیار تھا ؟ اس کا گمان بھی تھا ؟ اچھے خاصے ہٹے کٹے، تندرست توانا، مضبوط، چہرہ گل تر کی طرح شگفتہ، صحت فصل بہار کی طرح شاداب و تازہ، موت عین شادی کے گھر میں، عین شادمانی کی گھڑی میں آئی ! بڑے نورنظر اور چھوٹے لخت جگر کے سہرے کے کھلے ہوئے پھولوں کو روندتی ہوئی، مسلتی ہوئی، کچلتی ہوئی ! پھر کوئی جنگل بیابان نہیں، گاؤں اور دیہات نہیں۔ لاہور جیسا "متمدن" شہر، بہتر سے بہتر حکیم، حاذق سے حاذق ڈاکٹر، بلانے کے لئے ٹیلی فون آنے کے لئے موٹر، سکنڈوں میں خبر ہوگئی، منٹوں میں ڈاکٹر آئے، موت کی رفتار ان سب کے فرشتوں کی رفتار و دلوں سے تیز تر نکلی — جو ہستی مجسم حیات تھی، جس کی رگ رگ میں زندگی اور قوت کی تیز نبض اچھل رہی تھی، آناً فاناً بجھ گئی، ختم ہوگئی، قبل اس کے کہ علاج و تدبیر کوئی ادنیٰ بھی ہو سکے۔ !

دنیا ایک بڑی اور ماسبق سکندر نام کی ایک اور شخصیت سے بھی واقف ہے۔ اقبالمندی اور دنیوی خوش نصیبی کے لحاظ سے ان مرحوم سے بھی کہیں برتر۔ وہ دنیا کا فاتح اعظم تھا سارا یونان فتح کیا، ایران کو مسخر

سلہ صدق ۱۸ فروری ۱۹۴۳ء

کیا دارا کا تختہ الٹ دیا، عراق میں، توران میں پنجہ گاڑا، خراسان کو، شمالی ہندوستان کو زیر کیا بلخ کو، بخارا کو، ترکستان کو تابع فرمان کیا، عین زمانہ شباب میں عالم مسافرت میں خود اپنا وقت موعود آپہونچا تو زور آوری ختم تھی۔ اور ساری کوششیں تدبیریں بے اثر، معززہ گھڑی، ایک سکنڈ کے لئے، ایک سکنڈ کی ہاریک سے باریک کسر کے لئے نہ بڑھ سکی نہ پیچھے ہٹ سکی۔!

جاہ و حشم کی خوش تدبیری، طبیبوں کی حذاقت، تیمارداروں کی دردمندی اگر کہیں بھی سپر بن سکتی تو ماضی میں سکندر یونانی اور حال میں سکندر پنجابی یقیناً موت کی گرفت سے باہر رہے ہوتے! غفلت کے بند دریچے کی آنکھ اب بھی بند ہی رکھوگے، بیخودی کے متوالو ہوش اب بھی نہ آئے گا؟

سکندر مقدونی کا انجام تو اللہ کو معلوم سکندر پنجابی کا حال اللہ کے کرم سے ہم پر آپ پر سب پر روشن ہے الحمد للہ کہ مسلمان تھا، ہمارا بھائی تھا، توحید کا قائل، رسالت کا معتقد، اسلام کا کلمہ گو محمدؐ کی امت میں شامل، نماز کا پابند، روزہ کا شدت سے پابند، کلام الٰہی کی اشاعت کا ساعی اپنی بصیرت کے مطابق امت محمدیؐ کی فلاح کا داعی، اپنے کو عمر بھر مسلمان کہلا مسلمان سمجھا اور ظاہرت ماحول لباس کے موافق اپنے کو مسلمان بنا کر رکھا، فیلڈ مارشل ویول کے پیام رائٹ آنریبل چرچل کے سلام، فوج کی سلامیاں لاٹ صاحب کے ہاں کی حاضر باشیاں سب جسم کی کثافتیں تھیں، یہیں زیر زمین دفن ہو گئیں۔ روح عرفانی لطافتوں کے پانی سے دھل کر اور نکھر کر ان آلائشوں سے پاک

ہوئی اور ان قیدوں سے آزاد ان کے بازؤں سے ترچھی اور یقین و اعتقاد کے پروں سے عالم بالا کی سمت میں بلند ہوئی، ہزاروں اہل دل والوں کی دلی دعاؤں کے ساتھ، ہزاروں آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ ۔

نازم بیداری کہ تنہا می روی :

شاعر، ادیب و صحافی

مرزا ثاقب[۱]

بات ۱۹۱۲ء کی ہے۔ لکھنؤ کے خوش ذوق رئیس چودھری شفیق الزماں صاحب تعلقدار گڑھی بھلول نے رقعہ لکھکر مجھ سے دریافت کیا کہ ایک ادبی حلقہ میں ذیل کے دو ہم مضمون شعروں کے متعلق بڑی بحث چھڑی ہوئی ہے۔ محاکمہ آپ کیجئے۔ دونوں شعر یہ ہیں۔

(۱) شب جو زنداں میں ہوئی تا نہ گرفتاروں کو
سر یہ ٹکرایا کہ در کر دیا دیواروں کو

(۲) شب کو زنداں میں مرا سر پھوڑنا اچھا ہوا
آج کچھ کچھ روشنی آنے لگی دیوار سے

شعر بادی النظر میں اور پہلی دفعہ پڑھنے میں پہلا ہی اچھا معلوم ہوا لیکن ذرا سوچنے کے بعد بعد ترجیحی رائے دوسرے شعر کے حق میں قائم ہوئی اور یہی میں نے چودھری صاحب کو جواب میں لکھ بھیجا۔[۲]

---

[۱] مولانا دریابادی کا یہ مضمون ۵ر دسمبر ۱۹۴۶ء کے روزنامہ تنویر لکھنؤ میں مرزا ثاقب کے انتقال کے کچھ عرصہ بعد شائع ہوا تھا۔ (ع۔ ق)

[۲] مولانا فرماتے ہیں کہ مجھے تو اولاً پہلا ہی شعر پسند آیا تھا لیکن مولوی محمد عبدالسلام ندوی رفیق دار المصنفین (صاحب شعر الہند) سے مشورہ لیا تو انھوں نے دوسرے شعر کو ترجیح دی اور بڑی حد تک ان کی رائے سے متاثر ہو کر میں نے اس دوسرے شعر کو ترجیح دی۔ پہلا شعر میر نفیس مرحوم کا تھا (ع۔ ق)

پہلے شعر میں لفظوں ہی کا زور ہے۔ ورنہ اتنا مبالغہ کہ سر ٹکرانے سے قید خانے کی دیواریں محض ٹوٹ پھوٹ کر محض در کی طرح کھل رہ جائیں۔ حد فطرت سے بڑھا ہوا ہے۔ اور پھر جب زنداں کی دیواریں ہی باقی نہ رہیں تو خود زنداں کا وجود کب باقی رہ گیا۔ قیدی آزاد ہو کر نکل ہی نہ بھاگیں گے؟ دوسرا شعر بے عیب ہے بلکہ کچھ کچھ نے انتہائی حسرت و بے کسی کی تصویر کھینچ دی ہے۔ تاریکی اس بلا کی ہے کہ قیدی کو یہ خفیف سی روشنی بھی بہت غنیمت معلوم ہو رہی ہے۔ پھر اتنا مبالغہ کہ سر ٹکرانے سے دیوار میں ہلکا سا رخنہ پیدا ہو جائے حد و د فطرت سے اس درجہ بعید بھی نہیں۔

غرض اپنی یہی رائے لکھ کر بھیج دی اور یہ خبر ہی نہ تھی کہ پہلا شعر کس کا ہے اور دوسرا کس کا۔ چودھری صاحب تو خیر خوش ہوتے ہی وہ ہی ایک روز بعد دیکھتا کیا ہوں کہ جناب مرزا ثاقب صاحب غریب خانہ پر تشریف لا رہے ہیں (میرا قیام اس وقت تک لکھنؤ ہی میں تھا) آئیں! یہ مرزا صاحب کہاں! ان کی تو نازک مزاجی (نازک خیالی نہیں) کی طرح مشہور ہے یہ تو بڑے بڑوں کے ہاں نہیں جاتے۔ مجھ غریب طالب علم کے ہاں (کالج اسی زمانہ میں چھوڑا تھا) کہاں قدم رنجہ فرمانے لگے! میں تو دور سے راستہ گلی میں بس ان کی صورت دیکھ لیتا تھا۔ کبھی بڑھ کر ملنے کی بھی ہمت نہیں پڑی تھی چہ جائیکہ انھیں اپنے گھر پر دیکھتا

کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں!

خیر بیٹھے تو فرمایا کہ آپ کا شکریہ ادا کرنے آیا ہوں چودھری صاحب نے آپ کا وہ خط مجھے دکھایا۔ آپ نے نقادی اور انصاف کا حق ادا کیا ورنہ وہ شعر تو میر ..... صاحب مرحوم و مغفور کا ہے۔ ان کے سامنے بھلا کون پوچھتا!

میں نے یہ سن کر اپنے دل میں کہا کہ چلو اچھا ہوا اپنے کو یہ خبر ہی نہ تھی کہ کون شعر کس کا ہے۔ ورنہ بہت ممکن تھا کہ میر ... صاحب کا نام سن کر مجھ پر بھی رعب پڑ جاتا اور انھیں کے شعر کو ترجیح دینے لگتا۔

میں تو دل نے کہا۔ باقی زبان بھی الفاظ ادا کرتی رہی کہ محض آپ کی عزت افزائی ہے میں
کس لائق ہوں۔ مجھے تو لکھتے ہوئے شرم آ رہی تھی کہ آپ حضرات اہلِ زبان کے مقابلہ میں زبان
کیا کھولوں؟

بس اس روز سے ثاقب صاحب مہربان ہو گئے لکھنؤ کے شاعروں میں عزیز صاحب
تو پہلے ہی سے مخلصانہ کرم فرما کے تھے اور وہ تھے بھی طبعاً متواضع و منکسر مزاج محشر صاحب بہ
صاحب سے حضرت اکبر الہ آبادی کے طفیل میں سرسری نیاز حاصل ہو گیا تھا۔ صفی صاحب
ظریف صاحب اور سب سے بڑھ کر مرزا سوا صاحب بھی عنایت فرماؤں میں تھے۔ ثاقب صاحب
کا مہربان ہو جانا ان سب سے بڑھ کر تھا۔

اسی صحبت میں خوش ہو کر اپنا کلام بھی زبانی سنایا غزل کا مطلع ہے اور دو چھوٹے
چھوٹے مصرعوں کے اندر حسن و عشق کی پوری داستان رنگین سمیٹ لی ہے ؎

کہاں تک جفا حسن والوں کی سہتے
جوانی جو رہتی تو پھر ہم نہ رہتے

ادھر پھر جو ایک شعر پڑھا ظالم نے تڑپا ہی دیا ؎

بڑے شوق سے سن رہا تھا زمانہ
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

شعر بلا ترنم کے تحت اللفظ پڑھتے لیکن ہاتھ اور چہرے کے اشاروں سے مضمون کی تصویر
بھی کھینچتے جاتے۔ دوسرا مصرعہ جب پڑھا ہے تو آنکھیں ذرا بند کر کے سر کو ایک طرف اس طرح
جھکایا اور ہاتھ کو اس کے نیچے اس طرح لائے کہ جیسے سچ مچ تکیہ پر سر رکھ کر سو ہی گئے ہیں
اس ہیچ مداں نے شعر کی تکرار اس کثرت سے دوستوں کے سامنے کی اور اپنی تحریروں میں اتنی
بار دہرایا کہ اب وہ شعر بے تکلف سب کی زبانوں پر چڑھ گیا ہے ضرب المثل بن جانے کی صلاحیت
اس میں موجود ہی تھی۔

مولانا شبلی مرحوم و مغفور یادگر لیجیے کردہ الفاروق کے مصنف تھے، شہر کے شعراء اہل سخن و ارباب ادب سے تعلقات اچھے خاصے رکھتے تھے۔ بلکہ عزیز صاحب کا تعارف اس خاکسار سے انھیں نے کرایا تھا۔ ثاقب صاحب سے بھی ان کے مراسم تھے۔ ۱۹۱۳ء میں ہنگامہ مسجد کانپور پیش آیا۔ پولیس نے مجمع پر گولی چلائی اور بڑے بوڑھوں کے ساتھ کچھ لڑکے بھی شہید ہوئے۔ شبلی نے متاثر ہو کر ایک ماتمی نظم کہی اس میں اس موقع پر ان مقتول لڑکوں کے والدین رات کو ان کی واپسی کا انتظار کر رہے ہیں اور ان کے قتل سے بےخبر ہیں ایک مصرع تھا ؎

یہ لڑکے ہیں بہت جلد انکو سو جانے کی عادت ہے،

نظم ثاقب کو سنائی ثاقب نے داد دی مگر یہ کہا کہ یہ مصرع لکھنؤ کی زبان میں نہیں مولانا نے کہا بسم اللہ اصلاح ارشاد ہو۔ یہ یوں ہو جائے تو بہتر ہے ؎

یہ بچے ہیں سویرے ان کو سو رہنے کی عادت ہے،

مولانا نے انصاف پسندی کے تقاضے سے جو اہل کمال کا خاصہ ہے بے تکلف اس ترمیم کو قبول کر لیا۔ ثاقب صاحب باشندہ لکھنؤ کے نہیں اکبرآباد (آگرہ) کے تھے لیکن لکھنؤ کی زبان کا جہاں تک تعلق ہے کسی لکھنوی سے نہ ہیٹے تھے نہ پیچھے۔

اس نیاز مند سے حسن ظن آخر تک قائم رکھا کئی سال کا ذکر ہے کہ پہلے خط لکھ کر اور پھر لکھنؤ میں خود مل کر زبانی فرمائش کی کہ دیوان مرتب ہو گیا ہے اس پر مقدمہ تم ہی لکھ سکتے ہو، لکھ دو۔ اب اتنی فرصت کہاں نصیب تھی بہت دب دب کر اور پیچ پیچ کر معذرت کرنی پڑی۔!

افسوس کہ یہ شمع سخن ۲۲ نومبر ۱۹۴۶ء (۲۷ ذی الحجہ ۱۳۶۵ھ یوم جمعہ) گُل ہو کر مجلس ادب سونی کر گئی۔

ایک گمنام نامور

قصبہ کاکوری (ضلع لکھنؤ) کی اطلاع ہے کہ منشی امیر احمد علوی نے ۲۰ویں شنبہ رمضان مطابق ۱۳ مئی ۱۹۵۲ء کو اپنے وطن میں غالباً ۸۲ سال کی عمر میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم اردو کے ان چند ادیبوں میں تھے جو صحت زبان کی فکر و پرواہ رکھتے تھے۔ الفاظ و محاورات کی صحت، ترکیبوں کی صحت کے لئے کاوش و اہتمام رکھتے تھے۔ اُن بے استادے اہل قلم میں نہ تھے جن کے ہاں کوئی بھی رکیک ہوا عوام پسند فقرہ ہر عیب اور ہر جہل کا پردہ پوش بن جاتا ہے تاریخ اسلامیات، نقد و ادب پر خاص توجہ تھی۔ تاریخ زوال بنی اسرائیل، سفر سعادت، مثنویات؛ ابوظفر بہادر شاہ، تاریخ مالوہ انکی کتابوں کے نام اس وقت یاد پڑ رہے ہیں۔ زبان کا ذوق شروع ہی سے تھا۔ کیننگ کالج لکھنؤ سے بی۔ اے کرنے کے بعد ڈپٹی کلکٹری وغیرہ کے منصبوں پر فائز رہنے کے باوجود خدمت علم و ادب کیلئے بھی برابر وقت نکالتے رہے۔ زیادہ تر اپنے ہی صوبہ میں رہے پھر آخر میں سی، پی میں ڈسٹرکٹ ججی کے اختیارات بھی مل گئے تھے۔ اہل کاکوری کی نفاست پسندی اور مہمان نوازی مشہور ہے اور مرحوم ان حیثیات سے پورے کاکوروی تھے حسن اتفاق سے اسی سال کرنے گئے جو مدیر صدق کا سنہ حج تھا ۱۹۲۹ء۔ منیٰ اور مدینہ منورہ میں ساتھ رہنے کے علاوہ واپسی میں جہاز پر بھی رفاقت رہی اور جب اپنا سفرنامہ سفر سعادت کے نام سے مرتب کیا تو اس پر دیباچہ اسی نامہ سیاہ سے لکھوایا۔

صدق ۱۳ جون ۱۹۵۲ء

بڑے گہرے مذہبی تھے۔ آخری سن میں نہیں بلکہ شروع سن میں جو دلولوں اور امنگوں کا زمانہ ہوتا ہے، اور یہ تازہ گریجویٹ تھے اس وقت بھی ادبی بحثوں میں فرنگیت کا مقابلہ اور مشرقیت و اسلامیت کی تائید کرتے رہتے تھے۔ شرافت اور خوش ذوقی کے ایک پیکر مجسم تھے۔ اشتہار بازی اور خودنمائی کے تازہ بہ تازہ (اپ ٹو ڈیٹ) طریقوں سے اوافقف تھے اس لئے وہ شہرت و ناموری حاصل نہ کر سکے جس کے اپنی ادبیت کی بنا پر مستحق تھے اور عمر بھر نسبتہً گمنام ہی سے رہے۔ اللہ اونچے سے اونچے مرتبہ نصیب کرے بسفر آخرت کیلئے رمضان کا ماہ مبارک ملنا خود ایک دلیل مغفرت و مغفوریت کی ہے۔

——— x x ———
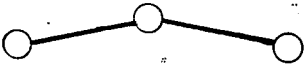
سید علی عباس حسینی

سید علی عباس حسینی کے نام سے صدق کے حلقے والے بہت ہی کم واقف ہونگے۔ ترقی پسندوں کی صف اول کے لکھنے والوں میں تھے۔ لیکن ان میں ترقی پسندی کی کوئی ادا مشکل ہی سے موجود تھی۔ نہ تعلّی و خودستائی نہ فحش و عریانی، نہ رکاکت و ابتذال اور نہ خدا اور مذہبیت پر چوٹیں۔ اسی ستمبر کے آخر میں ایک طویل علالت کے بعد لکھنؤ میں تقریباً ۷۰ سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

افسانے، افسانچے، ناول متعدد لکھ گئے۔ ایک کتاب اردو ناول نویسی کی تاریخ پر بھی ہے۔ رہنے والے ضلع غازی پور کے قصبہ بارہ کے تھے مدت سے لکھنؤ ہی کو وطن بنا لیا تھا مذہب امامیہ رکھتے تھے۔ شروع زندگی میں مذہب سے شوخیاں کر جاتے تھے۔ رفتہ رفتہ خود مذہبی ہو گئے تھے۔ اور آخر عمر میں بیشتر مطالعہ قرآن مجید اور تفسیر ہی کا رہ گیا تھا۔ ہر ملاقات میں دینی تذکرے کرتے رہتے تھے۔ غازی پور، بارہ بنکی اور خود لکھنؤ کے بعض اسکولوں کے ہیڈ ماسٹر اور پرنسپل رہ چکے تھے۔ انگریزی تحریر پر بھی پوری قدرت حاصل تھی۔ مدیر صدق سے اپنی طالب علمی کے زمانہ میں کچھ تھوڑا بہت پڑھ لکھ لیا تھا۔ اس رشتہ کا ادب و احترام آج تک قائم رکھے ہوئے تھے۔ امریکی ناول جنسیات و لغویات سے لبریز ہوتے ہیں ان کا وہ بہ کثرت مطالعہ کرتے رہتے لیکن کمال یہ تھا کہ ان کا جربہ اثر نے میں ان لغویات سے بالکل پاکدامن رہتے۔ بڑے ہی شریف مہذب، شائستہ و نستعلیق تھے۔ لکھنؤ کے شیعہ سنی مجادلہ سے بیزار رہتے۔ صلح کل کتابیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر لاتے اور ان کی اشاعت کرتے رہتے۔ حق تعالیٰ عاقبت بخیر

(صدق جدید ۱۰ اکتوبر ۱۹۶۹ء)

قمر احمد علیگ مرحوم

محمد آباد ضلع غازی پور یوپی سے یہ تاسف انگیز خبر شائع ہوئی کہ حاجی قمر احمد بی اے ایل ایل بی وکیل اپنے وطن میں ۸ جون (۱۸ رمضان) کو بعارضہ ضیق النفس وفات پا گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون
علی گڑھ کے شیدائیوں بلکہ فدائیوں میں تھے۔ ابتداءً مضمون علیگیات پر لکھتے رہے ساتھ ہی وکالت کی پریکٹس بھی۔ سنہ ۲۰ء و سنہ ۲۱ء میں جب تحریک خلافت کا شباب تھا تو ملک کے سیکڑوں پرجوش وکیلوں کی طرح انھوں نے بھی ترک موالات پر عمل کیا۔ اور اچھی چلتی ہوئی وکالت سے ہاتھ دھو بیٹھے اور کچھ ہی روز بعد بمبئی جاکر روزنامہ خلافت کو ہاتھ میں لے لیا۔ خلافت مولانا شوکت علی کی زیر نگرانی تحریک خلافت و ترک موالات کا نقیب خاص اور اس وقت اپنے عروج شباب پر تھا۔ قمر احمد کا قلم و دماغ سالہا سال ملت کی خدمت خلوص کے ساتھ انجام دیتا رہا۔ اپنے سیاسی خیالات میں نیشنلسٹ تھے لیکن بڑے پختہ مسلمان۔ اپنی اسلامیت کو ہر دوسری چیز پر مقدم رکھنے والے علی برادران کے تو خاص مخلصوں اور ارادتمندوں میں تھے۔ خلافت ہی کے ایک وفد کے سلسلہ میں زیارت حجاز سے بھی مشرف ہو آئے تھے۔ چہرہ پر داڑھی اور نماز کے پابند۔ بمبئی میں رہنے اور ہر طرح کے موقع حاصل ہونے کے باوجود "لیڈری" شان کے قریب بھی نہ گئے۔ اپنے کو محض خدمت گذار ہی سمجھتے رہے۔ مزاج سلجھا ہوا۔ غصہ اور تیز زبانی گویا جانتے ہی نہ تھے۔

صدق ۲۵ جون ۱۹۵۲ء

"چار سال ہوئے خیال پیدا ہوا تھا کہ تاریخ تحریک خلافت مرتب ہونا چاہیئے
اگر یہ مرتب نہ ہوئی تو مسلمانان ہند کی جدوجہد کا ایک بڑا اسان نامہ تاریخ میں غیر
مرتب رہ جائے گا۔ ایسی کتاب کے بہترین لکھنے والے وہی ہو سکتے تھے مشیت الٰہی
کو یہ منظور نہ ہوا۔ رمضان مبارک کا پہلا عشرہ عشرۂ رحمت ہوتا ہے اس کی آمد کو وفات کا
بجائے خود دلیل مغفوریت ہے۔

ایک پرانے صحافی کی وفات[1]

○

مولوی ریاض الرحمٰن خاں شیروانی ایم اے کا مکتوب، ۹ دسمبر کا چلا ہوا علی گڑھ سے
"شب گزشتہ میں مولوی محمد مقتدیٰ خاں شیروانی نے ۹۱ سال کی عمر میں وفات پائی۔ آج
بعد دوپہر تدفین عمل میں آئی۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے بہت وضعدار اور شفیق بزرگ تھے۔
مرحوم سید جالب مرحوم کے معاصر تھے اور اردو صحافیوں میں شاید سب سے معمر اہل قلم
اور علی گڑھ کے مشہور شیروانی خاندان کے سب سے محترم اور دیرینہ سال مرد بزرگ۔ گریجویٹ
اولاً میں، علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ (ہفتہ وار) کی ادارت محسن الملک و وقار الملک کے زمانہ
میں کی۔ اور اس کے بعد علی گڑھ گزٹ نامی اخبار کی اور تحریک موالات میں اس تحریک کے شدید حامی
ہو کر قلم میں جان بھی اور زور بھی تھا اور صحافت کے علاوہ رسالۃ الایمان اور شاید کچھ اور دینی کتابوں
کے مصنف تھے، اور علاوہ لکھنے پڑھنے کے پریس کے کام اور انتظام میں بھی بڑا سلیقہ اور گہرا
تجربہ رکھتے تھے اور فرض شناسی اور کارگزاری میں تو اپنی نظیر بس آپ ہی تھے اور مزاج

[1] منقول از صدق جدید ۲۲ دسمبر ۱۹۶۳ء

شوخی اور تشخول اس غضب کی تھی کہ غالب کی لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی کی یاد تازہ کر
کلج یالیونی ورسٹی کے ایک ڈنر میں شریک ہوئے۔ خاکا ایک نظم میں کھینچا شوخی کا اندازہ نمونہ کے
شعرے کر لیجئے۔ ؎

ہر اک مہمان مُرغ اڑاتا رہا
مگر ایک میں، کڑ کڑاتا رہا

احتیاط زندگی کا ایک کرشمہ یہ تھا کہ ۹۰ سال کی عمر تک پیدل مسافت اچھی خاصی چل لیتے
اور خط کا جواب بھی پہلی ڈاک سے دیتے تھے۔

معمولات عبادت بھی برابر جاری رکھتے مغفوریت اسی سے ظاہر ہے کہ تاریخ عین وسط
رمضان کی پائی اور رات جو ملی وہ جمعہ کے متصل رہی بیت اللہ کی نعمت سے بھی سرفراز ہو
چکے تھے۔

ایک مخلص خصوصی کی وفات[۱]

※

اردو کے ایک معروف و مقبول اہل قلم صحافی مولوی سید رئیس احمد جعفری ندوی
(لاہوری)، ۲۷ اکتوبر کو لاہور میں وفات پا گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون
صحت سالہا سال سے بہت ہی خراب چلی آرہی تھی۔ آخر وقت موعود نے آلیا بندہ
نے رب و مالک کے حضور میں پہونچ گیا۔
خیرآباد (اودھ) کے رہنے والے تھے اور مشہور اردو شاعر ریاض خیرآبادی کے

---

[۱] صدق جدید ۸ نومبر ۱۹۶۸ء

فائے۔ تعلیم ندوہ میں پائی اور پھر جامعہ جا کر پڑھے۔ مضمون نگاری کا شوق شر
سے تھا اور دلی تمنا یہ تھی کہ جامعہ ازہر (مصر) جا کر وہاں سے سندِ علم و فضیلت لائیں
آرزو تو کسی طرح پوری نہ ہو سکی البتہ جامعہ سے نکل کر صحافت کی لائن میں داخل ہو
اور پہلے روزنامہ خلافت (بمبئی) اور پھر کئی دوسرے اخباروں میں کام کیا۔ بڑے محنتی مسـ
اور کارگزار تھے۔ مولانا محمد علی کا زمانہ تو نہ مل پایا۔ البتہ مولانا شوکت علی کے منظورِ نظ
اور معتمد علیہ رہے۔ پاکستان بننے پر پہلے کراچی گئے اور وہاں سے لاہور منتقل ہو گئے ا
عمر وہاں کے ادارہ ثقافت اسلامیہ میں کاٹ دی۔

مزدوری نے بڑا زود نویس بنا دیا۔ ہزار ہزار صفحات لکھ ڈالے معروف و معتبر
ناول نویس کی حیثیت سے ہوئے۔ لیکن مولف سیرت محمد علی اور علی برادران کے بھی

اور عربی سے کئی دینی اور غیر دینی کتابوں کا ترجمہ اردو میں کیا۔ اپنے معاصرین پر ایک
دلچسپ جلد دید و شنید کے نام سے شائع کی اس کا دوسرا ایڈیشن نکالنے کی فکر میں
آخر تک رہے۔ علی برادران سے نسبت عشق رکھتے تھے۔ یتیم بچپن ہی سے ہو گئے تھے۔ تعلیم و
تربیت ایک صاحب عزم ماں نے دی۔ اور یہ بھی ان کے مطیع و معتقد اپنے بڑے بھا
سید عقیل احمد عقیل کی طرح ان مرحوم کے آخری وقت تک رہے۔

اور مدیر صدق اپنی کیا کہے۔ اس کے تو خصوصی مخلصوں بلکہ فدائیوں میں تھے
تعلقات کی عمر ۴۰۔ ۴۲ سال کی ہو چکی تھی۔ ندوہ میں پڑھ رہے تھے جب ہی سے غیر معمولی
حسن ظن پیدا کر لیا تھا جو زندگی بھر قائم رہا ـــــ اللہ پاک اپنی غریق رحمت فرمائے

~~~
~~~

پروفیسر[1] احتشام حسین رضوی مرحوم

○

اُردو پر جو مخلص اپنا جی جان قربان کئے ہوئے ہیں اور اردو کو اپنا اوڑھنا بچھونا
بنائے ہوئے ہیں ان میں کوئی احتشام سے بڑھ کر تو کیا ہوتا۔ کوئی ان کے برابر کا ان کی ٹکر
کا نکل آئے تو بھی بڑی بات ہے۔ دعویٰ زبان سے کرنے والے بیشمار ہیں لیکن میزانِ اخلاص
پر پورے اُترنے والے کچھ تھوڑے ہی سے ہیں، اور ان چند میں بھی خاص بلکہ یہ کہیے اخص
الخواص کہلانے کے قابل جو دو ہی چار ہیں ان میں ایک وہ مرحوم تھے، جن کی یاد منانے اور ان
پر آنسو بہانے ہم سب جمع ہوئے ہیں۔ پرانی ہندوستانی اکاڈمی الہ آباد والی ہو تو،
اور نئی اردو اکیڈمی لکھنؤ والی ہو تو، آل انڈیا انجمن ترقی اردو علی گڑھ کی ہو تو، ادارہ فروغ
اُردو لکھنؤ کا ہو تو، شعبہ اردو لکھنؤ یونیورسٹی کا ہو تو، الہ آباد یونیورسٹی کا ہو تو، اردو
کا کوئی سا بھی شعبہ یا ادارہ ہو، سرکاری یا غیر سرکاری، سب سے ان کا یکساں تعلق،
ملک گیر ہو، ریاستی ہو، سب سے ان کا مساوی ربط، وہ ہر ایک کے خادم و نیاز مند، اور
پھر یہ تو ان کا اجتماعی سلسلۂ خدمات ہوا۔ رہا شخصی و انفرادی سلسلۂ تعلیم و تصنیف،
تدوین و تحقیق یہ سب اس کے علاوہ، اسوا سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں صفحے کتابوں اور مقالوں
کے حجم کی صورت میں کس نے ۳۰ سال کی مدت میں تیار کر ڈالے، تنقید کے، تاریخ ادب کے
اور سوانحوں کے ڈھیر لگا دیئے، اُردو کی خدمت بہر عنوان بہر صورت، یہی مشغلہ رہی،

---

[1] منقول از صدق ۹ر جنوری ۱۹۷۳ء۔ تقریر جو جلسۂ تعزیت لکھنؤ میں ۱۴ر دسمبر ۷۲ء کی شب کو سنائی گئی۔

وضعدار، وہی حال، وہی قال، وہی جمال، وہی کمال، اردو میں ناقد تو پہلے بھی بڑے بڑے ہو چکے تھے اور سخن فہم سخن سنج حالی و شبلی کے سے گزر چکے تھے۔ لیکن وہ سخن فہمی تمام تر ذوقی ووجدانی تھی کسی ترکیب کی ندرت پر جھوم اٹھے کسی فقرے کی دروبست کی نزاکت پر داد کے ساتھ دل دے بیٹھے لیکن تنقید بحیثیت فن دو دو احتشامی سے قبل اردو میں کہاں آئی تھی تنقید کے اصول و مباحث مغرب سے لا لا کر مشرق کے مدرسوں میں کس نے پھیلائے تھے! یہ نئے نئے رنگ و وضع کے گل و بوٹے شبستان مشرق میں کس نے کھلائے تھے یہ نت نئے سبق اپنے ہموطنوں کو کس نے پڑھائے تھے۔؟

اُردو کا مورخ ادب اس موضوع پر جب قلم اٹھائے گا اور اس فن کے بانیوں کا نام گنائے گا تو اردو والوں میں نام اس عالیشان کا، والا احتشام کا ضرور آئے گا۔ حضرت رومی نے اپنی مثنوی میں عشق کو مخاطب کر کے فرمایا ہے ؎

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما
اے طبیب جملہ علت ہائے ما
اے دوائے نخوت و ناموس ما
اے تو افلاطون و جالینوس ما

اے عشق کے بجائے اردو زبان، یا اردو زبان کے عشق کو رکھ لیجیے۔ اور اس کلام کو احتشام مرحوم کی روح کی زبان پر بلا تکلف جاری کر دا دیجیے۔

مرحوم نے اپنی زندگی کا بہترین حصہ لکھنؤ یونی ورسٹی میں گزارا، اور اس کے ذریعہ سے اردو اور اردو دلپسندی کو جتنا پھیلایا، خصوصاً اردو بیزاری کے عین زمانہ میں، وہ بھی انھیں کا حصہ تھا۔ اور پھر اب کئی سال سے یہی جہاد لطیف ان کا الہ آباد یونیورسٹی کے ذریعہ سے جاری تھا۔ یہ بھی انھیں کا حصہ تھا۔ سیکڑوں کی تعداد میں تو اپنے قابل فخر شاگرد انھوں نے چھوڑے ہیں۔ خالق کائنات کی مشیت اور مصلحتوں میں کون

دم مار سکتے ہے، ورنہ اس درجہ وضعیت اور ناگہانی اس حیثیت فیض کی بندش ہم بندوں کی سمجھ میں تو آتی نہیں۔ بے ادبی نہ سمجھی جائے تو دل جلا ہوا اور پکا ہوا ہر اردو والے کا یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ اردو کی مخالف تکوینی قوتوں نے موت سے سازباز کر لیا ہے اور اردو کے سودا سے یوں میدان صاف کر دیا۔

میری اس تقریر مختصر کے بعد آپ کے مجلے میں تقریریں احتشام کے فن پر آئیں گی اور آپ ان فنی تقریروں کے تجزیہ اور تحلیل سے لطف اٹھائیں گے، اس حقیر کو تو اجازت دیجیے کہ مرحوم کی ذاتی صفات سے متعلق اپنے تاثرات و تجربات بھی کچھ عرض کر دے۔ ایسی بزرگ واسعت۔ ایسا انکسار، ایسی لطافت طبع، ایسی سلامت روی، ایسی خوشگوار رواداری بلکہ میں کہوں گا کہ ایسی بے نفسی اور مشرقی اخلاق کی جامعیت کم ہی کہیں دیکھنے میں آئی ہے۔ سن میں مجھ سے چھوٹے ضرور تھے لیکن برتاؤ دے میں اپنے کو چھوٹے سے چھوٹا دکھاتے تھے۔ کبھی کوئی نا ملائم یا غصہ کا لفظ ان کی زبان سے آتے تو میں نے کبھی سنا نہیں۔ اختلاف چاہے وہ سیاسی ہو، یا مذہبی یا ادبی ایسی حکمت و خوشگواری کے ساتھ وہ حلم و متانت سے ٹال جاتے کہ انانیت منھ تکتے لگتی اور خودداری عش عش کر کے رہ جاتی۔ ضابطہ سے تعلق تو شاید ترقی پسندوں سے رہا کیا لیکن سابقہ میں پتہ بھی نہ چلنے پاتا کہ ترقی پسند ہیں یا مجھ جیسے تنزل پسند قیانوسی شاعروں کے کلام پر نہ مضحکہ نہ ان کے کسی دیوان کے مطالعہ سے بے نیازی۔ نہ استادوں سے مقابلے کے دم خم نہ اپنی تعلیوں کی رجز خوانیاں!

نہ ترقی پسندی کی ہمہمہ کا کوئی نشان نہ اس کے طنطنہ کی شان، ایک بار کیا ہوا کہ۔ نیڈیائی یا نشری مکالمہ کے سلسلہ میں نوبت شرکت کی آئی اور مجھ سے انٹرویو لینے آئے۔ میرے ایک جواب میں ریڈیو والوں کو کچھ کلام ہوا۔ مجھے یقین کہ میرا جواب سرے سے رد ہوا لیکن داد دی شرافت کہ احتشام صاحب نے خود اپنا سوال ہی اٹھا

واپس لے لیا۔ اور کمال بالائے کمال یہ کہ اس امکان بدمزگی پر بھی شرمندہ اور معذرت خواہ! ــــــ ایسے نفس کی شرافت کیوں کہئے! کرامت کیوں نہ کہیئے۔!

اس طرح کے نازک موقع بہ دو ایک کمیٹیوں میں بھی پیش آئے مگر وہ ہر موقع پر اپنی بڑائی اور برتری ہی کا نشان چھوڑ گئے۔

اس عالی کردار اور اس بے نفسی کے نمونے اگر عام ہو جائیں تو دنیا خصوصاً دنیا کے ادب سے رنجش و فساد کے امکانات بھی عنقا ہو جائیں، میں تو سمجھتا ہوں کہ مرحوم کو یہ احساس بھی کبھی نہ ہوا ہوگا کہ انھیں کسی سے اختلاف بھی ہے، ایسی پاکیزہ صفات ہستیاں خصوصاً ادیبوں میں اب کہاں دیکھنے کو ملیں گی۔!

ایک مردِ مومن کی وفات[۱]

آہ عبدالمجید خاں، بی اے (عثمانیہ) ایڈیٹر الہدیٰ، (حیدرآباد دکن) رمضان کے مبارک[۱]
کی دوسری تاریخ تھی اور پہلا جمعہ، جون ۱۹۵۱ء کی صبح کے وقت مردِ مجاہد وطن سے دور
عظیم آباد میں ایک طویل اور صبر آزما علالت کے بعد اپنے مالک و مولا کے حضور میں پہونچ گیا۔ انا
للہ وانا الیہ راجعون۔

بڑے جری و دلیر اور جذبۂ اسلامیت اور حق گوئی کے لحاظ سے اپنی مثال آپ تھے۔
مدتوں دکن کے مشہور اسلامی روزنامہ رہبرِ دکن میں گمنام کام کرتے رہے اور ستمبر ۱۹۴۸ء
کے انقلابِ دکن کے بعد اپنا ذاتی ہفتہ وار الہدیٰ نکالا۔ اور دنیا کو دکھایا کہ مردِ مومن کی زبان
ہر ممکن خطرہ کے باوجود خود اظہارِ حق میں کیسی بیباک رہ سکتی ہے۔ یہ وہ وقت تھا کہ اچھے اچھوں
کی ہمت جواب دے چکی تھی اور پرانے آزمودہ کاروں کے چھکے چھوٹ چکے تھے لیکن عبدالمجید
خاں کے لیے معلوم ہوتا تھا کہ زمین و آسمان ہی کوئی دوسرے ہیں۔ اسی قلم رانی کو
بدستور رکھتے رہے جب تک وفات سے چند مہینے قبل کچھ تو علالت اور کچھ مالی مشکلات کے
باعث پرچہ بند کرنے پر مجبور نہ ہو گئے۔ جب تک لکھا قوتِ ایمانی کی اس جرأت و ہمت سے
لکھا کہ کم از کم صدق کے ایڈیٹر کو تو رشک آ گیا۔

عمر بھی کیا پائی زیادہ سے زیادہ پچاس کے ہوں گے۔ سچ جب ابتداءً ۲۵ء کے

---

[۱] ۲۲ جون ۱۹۵۱ء

شروع میں نکلا ہے یہ اسی وقت جامعہ عثمانیہ کے طالب علم تھے اور سچ کے بڑے ہی قدر بڑھانے والوں میں تھے۔ مجھ سے مراسلت اسی زمانہ سے شروع کر دی اور اگست ۲۵ء میں جب میرا جانا حیدرآباد کا ہوا تو آکر بڑی محبت بڑے تپاک بڑی عقیدت سے ملے۔ ان کے متعدد مراسلے بھی اسی زمانہ میں نام سے یا گمنام سچ میں نکلے۔ طبیعت کو کشف کوئی اور اشراقیت سے خاصی مناسبت تھی اکثر عزیزوں دوستوں کی موت کا علم ان کے وجدان کو پیشتر سے ہو جاتا اور خواب میں بھی عجیب عجیب پیش بینیاں کرتے رہتے۔ اپنے حسن ظن اور تمام تر غلط حسن ظن) کی بنا پر ان اسرار کا حل مجھ جیسے ناآشنائے فن سے چاہا کرتے۔ اگر اس زمانے کے ان کے خطوط میرے ذخیرے میں کہیں دبے پڑے ہوئے نکل آئے تو ان کا مطالعہ بجائے خود بہت دلچسپ ہوگا۔

خط و کتابت موقوف ہوگئی اور برسوں ان کا کچھ پتہ نہ چلا ۴۵ء یا ۴۶ء میں از خود انکی یاد بہت آنے لگی اور طبیعت میں تقاضا ان کے دریافت حال کا پیدا ہوا یہ شاید اسی اشراقیت کا اثر تھا کیا کہ بے شان و گمان حسین اس وقت ان کا ایک خط خوب مفصل موصول ہوگیا۔ اور اس کے بعد سے مراسلت ہر دو چار مہینہ کے وقفہ کے ساتھ ابھی مہینہ ڈیڑھ مہینہ ادھر تک جاری رہی۔ آخری خط میں اپنی علالت اور پرچہ کے التوا کا عارضی کی اطلاع دی تھی اس دور کے خطوط اگر سب چھاپ دیئے جائیں تو حیدرآبادی مسلمانوں کی شدید مظلومیت کی جیتی جاگتی تصویر نظر کے سامنے آجائے۔ بعض خطوط کے اقتباسات صدق میں مختلف عنوانات کے ماتحت نقل ہوتے بھی رہے ہیں۔ جمعہ کا دن رمضان کا مہینہ تپ کہنہ کا مرض پردیس کی موت رحمت و مغفرت کے اتنے سامان اس مرد مومن کے لئے نہ رکھے ہوتے تو اور کس کے لئے ہوتے اللہ اسے ان نعمتوں سے سرفراز فرمائے جو بہشتیوں سرفروشوں اور دین کے مجاہدوں کے لئے مخصوص ہیں۔ !

ظفر الملک مرحوم[1]

ظفر الملک اور عبدالماجد ایک زمانہ تک (اور اس کی مدت کئی سال تک قائم رہی) ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم رہے یا کم از کم دوسروں کی نگاہ میں سمجھے گئے، ایک قید عنصری سے گویا ایک ہی جھٹکے میں آزاد ہوکر جوار رحمت میں پہونچ گیا۔ دوسرا اپنے وقت موعود کے انتظار میں ہے۔ آج ان کا نام آنے سے ۳۶۔۳۷ سال کی کیسی کیسی پرانی باتوں کی یاد تازہ ہورہی ہے۔ اصل نام اسحاق علی علوی تھا۔ ظفر الملک غالباً تاریخی نام ہے ۱۹۰۰ء میں جب الناظر نکالا تو ایڈیٹری میں نام ظفر الملک کا ہوتا تھا اور بحیثیت پبلشر کے اسحٰق علی چھپتا تھا۔ لوگ سمجھتے تھے کہ الگ الگ دو شخصیتیں ہیں اور اس وقت کے آئین صحافت میں یہ معیوب بھی نہ تھا۔ ناموری اسی خاندانی نام سے

[1] صدق ۲۸ر فروری ۱۹۳۷ء

حاصل ہوگئی تھی اور اس پلے نسام کا نشان بھی مٹ گیا ——— جب برما، ہانگ کانگ وغیرہ مشرق ایشیا کی لمبی سیاحی کے بعد وطن واپس آئے ہیں تو بالکل صاحب بہادر تھے۔ سوٹ بوٹ میں ملبوس منہ میں سگریٹ داڑھی کا کیا ذکر۔ پہلی ملاقات مولانا عیلی کے ہاں مولانا ابوالکلام کے مواجہ میں ہوئی ان کا سن ۳۰-۳۲ سال، میں سترہ سال کا کچا طالب علم ۔ چند روز بعد میں نے طالب علمی کے پردہ میں الناظر کے لئے علمی مقالات شروع کر دیئے یہ رفاقت مدتوں رہی میں لا مذہب تھا۔ وہ رفتہ رفتہ سخت قسم کے مذہبی ہوگئے۔ چہرے پر داڑھی، وضع بھی خالص مشرقی، بیعت بھی مولانا عین القدس سرہ سے کرلی۔

دوسرا ساتھ جنوری ۱۹۲۵ء میں سچ کے اجراء سے شروع ہوا۔ پہلے وہ ایڈیٹر رہے اور میں مقالہ نگار خصوصی کچھ ہی روز بعد وہ منیجر اور میں ایڈیٹر یہ تعلق ۱۹۳۲ء تک قائم رہا۔ ۵ کے آخر میں نئی اودھ خلافت کمیٹی بنائی گئی۔ بنانے والے وہی تھے نام کے لئے صدارت پر میں بٹھا دیا گیا۔ وسط ۱۹۲۶ء سے مولانا محمد علی کے روزنامہ ہمدرد، دہلی کی ذمہ داری مشترک ہم دونوں نے لی، وہ منیجر اور میں نگراں اڈیٹر۔ لیجئے حقیقت کا ذکر تو بھول ہی گیا۔ ۱۹۱۹ء میں ہفتہ وار حقیقت ہم دونوں نے مل کر نکالا اور تقسیم یہاں بھی رہی۔ وہ منیجر اور میں صیغہ ادارت کا۔ کچھ روز بعد ہم دونوں علاحدہ ہوگئے اور عزیزی انیس احمد صاحب کے ہاتھوں جا کر وہ ختم ہوگیا ——— غرض ساتھ میرا ان کا جتنا رہا، کم کسی کا رہا ہوگا اور ان کی زندگی کے ہر پہلو سے واقفیت کے موقع مجھے رہے بجز ان کے قریب ترین عزیزوں کے شاید کسی کو بھی نہ رہے ہوں گے۔ اوصاف بہت سے تھے اور سود صفتوں کا وصف یہ تھا کہ دھن کے بڑے پکے تھے، اپنے عقائد دین میں بھی بڑے راسخ تھے۔ عمر کے آخری چند سال مدح صحابہؓ کی حمایت و ترویج میں بسر کئے۔ اب یہی اوڑھنا بچھونا رہ گیا تھا اسی میں جئے اور اسی میں دنیا سے رخصت ہوئے۔ اور عجب نہیں جو تنہا یہی عشق صحابہ ہی مغفرت بن گیا ہو۔ اللہم اغفرلہ وارحمہ

ہوش یار جنگ بلگرامیؒ

مرحوم سے میری ملاقات اس وقت کی ہے جب وہ نہ تو نواب تھے اور نہ خطاب یافتہ محض ہوش بلگرامی تھے اور ایک ماہ نامہ ذخیرہ کے ایڈیٹر۔ یہ ذکر ۱۹۱۷ء کا ہے جب میں پہلی بار حیدرآباد آیا۔ تحریری ملاقات اس سے دو سال قبل شروع ہو چکی تھی۔

ملاقات بہت جلد بڑھ کر دوستی تک پہونچ گئی اور یہ نتیجہ تمامتر انکی ملنساری اور یار باشی کا تھا۔ ورنہ میں تو اس وقت تک اپنی خشک مزاجی اور کم آمیزی کے لئے مشہور تھا کبھی اپنے ہاں کھانے پر بلاتے اور دھوم دھام سے دعوت کرتے کبھی شبرات کبھی عید وغیرہ کا حصہ بھیجتے۔ مہاراجہ کشن پرشاد بہادر شادؔ کے مصاحبوں میں تھے جن کی ادب نوازی علم پروری اور فیاضیاں زبان زد عام ہیں۔ اپنے "دور جاہلیت" میں میں نے ایک ڈرامہ بھی لکھا تھا نام سے نہیں گمنام۔ ایک روز ہوش اس کے دو نسخے لے کر مہاراجہ کی خدمت میں گئے اور راس قیمت دو اٹھنیوں کے بجائے دو اشرفیاں لے کر آئے۔ اشرفی اس وقت ۲۶ کی ہوتی تھی۔

کچھ ہی روز بعد ان کا ستارہ گردش میں آیا۔ حیدرآباد سے ہٹنا پڑا۔ بھوپال وغیرہ ہوتے ہوئے رامپور میں کئی سال جم کر رہے۔ میں بھی لکھنؤ آ چکا تھا۔ ان سے پینگ بڑھتے رہے۔ غالباً ۲۲ء تھا کہ مجھے اپنے ہمراہ حیدرآباد لے گئے اور راستے بھر بڑی الوالعزمی کا ثبوت دیتے رہے۔ حیدرآباد جب دوبارہ پہونچے ہیں تو دنیوی عروج خوب حاصل کیا۔ انکی زندگی

یکم دسمبر ۵۵ء

دنیوی اتار چڑھاؤ کا ایک مرقع تھی لیکن میرے ساتھ اپنی زندگی کے ہر دور میں یکساں برتاؤ، مہر و محبت، لطف و اخلاص ہی کا رکھا مذہبی اختلافات سے قطع نظر سیاسی روش بھی ان کی مجھ سے جُدا گانہ تھی۔ ادبی میدان میں بھی پوری ہم آہنگی نہ تھی ـــــ دوستی ان سب کے باوجود قائم بلکہ ترقی پذیر۔ اسے ان کی شرافت اور وضعداری کا اعجاز نہ کہئے تو اور کیا کہئے ـــ!

امین الملک سر مرزا کے دورِ وزارتِ عظمیٰ میں تو انھوں نے کمال ہی کیا۔ میرا وظیفہ تصنیفی ۱۹۱۰ء سے ایک حال پر چلا آرہا تھا ۱۹۲۶ء میں انھیں نے تحریک کر کے ان کو گویا مضاعف کر دیا ـــــ اور یہ سلوک تنہا میرے ساتھ نہ تھا۔ کئی سال قبل مولانا سید سلیمان ندوی کے لئے ذاتی وظیفہ حیدرآباد سے جاری کرا چکے تھے۔

صاحبِ قلم تھے اور شاعر بھی اور ان کی مثنوی "طوفانِ محبت" تو پڑھنے کے قابل ہے۔ آخری کتاب "مشاہدات" مکا ہر خیز کتاب ہے جس کے موافق اور مخالف دونوں پہلوؤں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے اس پر پرچہ صدق کے لئے کئی مقنے ہوئے لکھا جا چکا ہے اس کے بعض پہلوؤں پر مرحوم سے مراسلت جاری تھی۔

مذہباً شیعہ اور وسیع خیال شیعہ تھے لیکن عماد الملک سید حسین اور سید علی اور دوسرے بلگرامیوں کی آنکھیں دیکھے ہوئے اس لئے علماء اہلسنت سے بھی دل کھول کر ملتے اور ان کی پوری قدر کرتے۔ مولانا سید سلیمان ندوی مولانا مناظر احسن گیلانی دونوں سے خاص عقیدت رکھتے تھے اور ان کے بعد مولانا عبدالباری ندوی سے بھی ـــــ جس نے اللہ کے نیک بندوں کے ساتھ حسن سلوک کا مسلسل برتاؤ جاری رکھا اور جو اس کی توحید کی گواہی اور اس کے رسول کی تصدیق پر بہرحال زندہ رہا۔ اس کے ساتھ اگر آج تمام تر عفو و کرم کا معاملہ ہو رہا ہو تو کوئی اس پر حیرت کیوں کرے؟ ـ

چودھری محمد علی مرحوم

زندہ دلی، شگفتگی، لطیفہ گوئی، بذلہ سنجی، اگر مجسم ہو سکتیں تو عجب نہیں کہ قالب انھیں مرحوم کا اختیار کرتیں اور جو کہیں یہ چودھری صاحب یونانیوں کے دور شباب میں پیدا ہو رہے ہوتے تو ہو نہ ہو یہ دیوتا ظرافت تفنن و انبساط کے مان لئے جاتے اور بے تکلف ان کی پوجا چل پڑتی! ـــــ وہ دلوی بس نام کے تھے۔ ورنہ بول چال، چال ڈھال، ٹھاٹھ باٹ کے آئینہ میں ٹھیٹ ہی لکھنوی! وہی آن، وہی شان، وہی لوچ وہی چہل پہل لکھنے ہی میں نہیں بولنے میں بھی اور جلوہ مجلس کے تو جیسے بادشاہ تھے۔

بوڑھوں میں بیٹھے تو سنجیدہ و حکیم، جوانوں میں آنکلے تو سرمست و ظریف، بچوں میں گھر گئے تو کھلنڈرے۔ ادیب ہوں کہ طبیب، شاعر ہوں کہ اہل حرفہ، مولوی ہوں کہ مشائخ کسی کی بھی مجلس میں گزر ہو جائے میر مجلسی ان کے لئے رکھی تھی!

ناول اور افسانے کئی ایک لکھے اتالیق بی بی شاید سب سے پہلے کتاب ہے شاید نذیر صاحب کی فرمائش پر لکھی ہوئی۔ ایک اور کتاب آخری زمانہ میں کشکول فقیر محمد علی شاہ کے نام سے نکلی تھی۔ ایک محدود حلقہ کے اندر خوب قدر ہوئی۔ ہاتھوں ہاتھ لئے گئے، شہر عام نصیب میں نہ تھی نامور ہو کر بھی گمنام ہی رہے! ـــــ جنسیات کے ماہر تھے رشتہ انہا کے نہیں، قلم کی شرافت کا کمال یہ ہے کہ ہر ناگفتہ بہ کو پیش کرتے وقت گفتنی بنا دیتے

دسمبر ۵۹ء

ہیں۔ ایک چھوٹی سی کتاب (کتاب کیو لکھیا کہیے) پردے کی بات ہے اس میں شریف بہو بیٹیوں سے وہ باتیں کہہ گئے ہیں کہ جو کوئی رازدار سہیلی ہی کہہ سکتی ہے اور وہ بھی کان میں —— پڑھے ہوئے لکھنؤ کے مشہور تعلقہ داروں کے اسکول کالون اسکول کے تھے۔ انگریزی انگریزوں سے پڑھی اور کہی۔ انھیں کے لب و لہجہ میں خوب فراٹے سے بولتے۔ مطالعہ اپنی مشرقی چیزوں کا خوب کیا اور انگریزی میں دلدادہ برنارڈ شاہ، سمرسٹ ام، ٹیگور اور خلیل جبران کے رہے۔ ہاتھ پیر کے اچھے تھے اور رنگ خوب گورا چٹا جوانی میں سوٹ بوٹ پہن لیے پیدائشی انگریز بن گئے —— گہرے مذہبی آخیر عمر میں تو خیر ہو ہی گئے تھے اور آخرت کا نام آتے ہی خشیت سے لرزا ٹھتے مذہب سے باغی عمر کے کسی دور میں بھی نہیں رہے۔

تعلقہ دار تھے ایک مدت تک بڑے عیش و عشرت سے بسر کی اپنی رعایا اور پرجا سے اس وقت بھی میل جول کر رہے۔ پیدائش امامیہ خاندان میں ہوئی۔ لیکن جب نظر میں وسعت پیدا ہوئی اور تحقیق مسائل کا شوق تو اپنے کو بجائے شیعہ کے صرف مسلم کہلانے لگے۔ اہل سنت سے تعلقات یوں بھی بہت گہرے تھے۔ شادیاں متعدد کیں اکثر اہل سنت ہی کے ہاں۔ میرا ساتھ ۱۹۲۹ء میں سفر حج میں رہا۔ میں نے عبادت کرتے ہی نہیں، عبادت میں اس منصوبہ کو روتے بھی دیکھا۔ ایک ہی جہاز سے گئے ایک ہی سے واپس آئے بمبئی میں، مدینہ میں، مکہ میں ساتھ رہا۔ یہاں تک کہ واپسی میں ریل پر بھی نمازیں پڑھیں اپنے امامیہ طریقے پر لیکن ہم اہل سنت کی جماعت میں شریک ہو کر اور سنی امام کے پیچھے اور صرف وہیں نہیں دہلی اور دریاباد میں بھی —— ایک کتاب میرا مذہب کے نام سے لکھی ہے اس میں اپنے معتقدات عقائد کی شرح و ترجمانی کی ہے۔

مولانا ابوالکلام اپنی جوانی کے زمانہ میں جیسے شوخ، طرار زبان آور اور روان کے معتقدین سے دست بستہ معذرت کے ساتھ، مغرور بھی تھے۔ اس کا اندازہ بھی بعد میں دیکھنے والوں کو نہیں ہو سکتا۔ بات کرنا مشکل تھی۔ ابھی اسے بنایا، ابھی اس پر فقرہ چست

کیا کس کی مجال تھی جو ان سے ٹکر لے سکے ۔ ۱۹۴۲ء میں اس خاکسار نے اپنے یہاں خاتون منزل لکھنؤ میں مدعو کیا تو خیال آیا کہ مولانا کے مسلسل وار کون برداشت کرے گا۔ اُنھیں چودھری صاحب کو پکڑ بلالیا ــــ جو مرتے آخر تک کچھ برابر ہی رہی۔

ہنسی کی عمر آخر ختم ہوئی اور فالج میں مبتلا ہونے کے بعد ہنسوڑ نے اب مستقل رونا شروع کیا اور گریہ و زاری خوف آخرت سے؛ فرنگی محلی، ندوی، کسی قسم کی بھی مذہبی شخصیت کو جب پاجاتے رو رو کر اس سے دعائے مغفرت کا وعدہ لیتے اور اس کا ہاتھ اپنے سینہ پر رکھتے اور یہ مبارک کیفیت ایک دو دن نہیں مدتوں رہی۔ ؎

اے خنک چشمے کہ آن گریان اوست
اے خنک قلبے کہ آن بریان اوست

یہاں تک کہ ۱۰ر دسمبر ۱۹۵۹ء کو جمعرات کا دن آگیا۔ اسی دن سے طبیعت یک بیک زیادہ خراب ہوگئی۔ نماز ظہر بیٹھے لیٹے ادا کی پھر کبھی درود شریف پڑھتے کبھی اللہ اللہ کہتے۔ ۲½ بجے کا وقت آگیا اور پھر درود شریف پڑھا اور اللہ اللہ کہا اور اسی پر روح پرواز کرگئی ــــ تدفین شب جمعہ میں ہوئی۔ نماز حسب وصیت دو بار پڑھی گئی۔ ایک بار شیعوں نے پڑھی، ایک بار سنیوں نے۔ اور نمازوں میں شرکت بہت بڑی جماعت نے کی ــــ اللہ بال بال مغفرت فرمائے۔

حمید نظامی مرحوم

○

پاکستان میں تو خیر پڑھے لکھوں میں کون ایسا ملے گا جو نوائے وقت لاہور سے واقف نہو۔ ہندوستان میں بھی جو لوگ زیادہ اخبار بین ہیں ان کی بھی بڑی تعداد نوائے وقت سے صورت آشنا اگر نہیں تو نام آشنا تو ضرور ہی ہے ـــــ حمید نظامی اسی مشہور و معروف روزنامہ کے ایڈیٹر کا نام تھا جس نے اپنے کو چھپایا اور اپنے پرچہ کو چمکایا۔

۲۶ر فروری/۲۰ر رمضان، صبح سات بجے کام کے لئے میز پر بیٹھا ہی تھا کہ دفتر نوائے وقت کا تار پہنچا کہ ۲۵ر کو حمید نظامی عارضۂ قلب میں دنیا سے رخصت ہوگئے! انا للہ وانا الیہ راجعون ـــــ یا الٰہی یہ کیا غضب ہوگیا! خبر بالکل اچانک ملی۔ نظر کے سامنے اس توانائی مجسم پیکر عمل کی صورت پھر گئی۔ ہم دور افتادوں کو کوئی اطلاع معمولی سی بیماری کی بھی اس سے قبل نہیں پہونچ سکی تھی۔ دفتر والوں نے میرے اور مرحوم کے مخلصانہ تعلقات کا صحیح اندازہ کرکے مجھے فوراً ہی مطلع کر دینا ضروری سمجھا۔ انتقال ۱۲ بجے سے کچھ قبل ہوا۔ تار اسی وقت کی ساری مصروفیت اور پریشان خاطری کے باوجود ۲ بجے کے کچھ بعد روانہ ہوگیا۔

خبر پر یقین کرنے کو دل نہ چاہا، نہ دماغ اس پر آمادہ ہوا؛ تار پڑھا اور پھر پڑھا جب کوئی گنجائش تار کے مضمون کے جھٹلانے کی نہ رہی تو سناٹے میں آکر سر پکڑ کر رہ گیا۔ مشیت کے فیصلہ پر کس کو دم مارنے کی مجال ہے! ۴۳–۴۴ سال کا سن کوئی مرنے کا سن ہوتا ہے! اور مرحوم کے لئے تو کہنا چاہیے کہ ابھی جوانی ہی تھی۔ اور پھر استحکام پاکستان کے لئے کتنی

(صدق جدید ۹ر مارچ ۱۹۶۲ء)

شدید ضرورت ایسے ہی بے لوث، متوازن رہنما اور جوش و ہوش کے جامع صحافی کی تھی! ۔۔۔ ایک طرف یہ سوچ اور فکر جاری تھی دوسری طرف اضطرار اور بے اختیاری کے عالم میں مرحوم کی بال بال مغفرت اور بلندی مراتب کے لئے دعائیں بھی جاری تھیں!

اپنی زندگی میں صحافی خدا معلوم کتنے دیکھ ڈالے۔ گاندھی جی، محمد علی اور ابوالکلام کو اس صف میں نہ لائیے یہ لوگ اصلاً و مستقلاً لیڈر تھے صحافت اُن کے یہاں محض ضمنی و ثانوی حیثیت رکھتی تھی بیشتر صحافیوں کو عموماً قلم کا تاجر ہی پایا۔ حمید نظامی اس کلیہ میں استثناء کی ایک روشن مثال تھے صحافت ان کے یہاں پیشہ تھا تجارت نہ تھی۔ ایک خدمت تھی۔ زندگی کا ایک مشن تھا ایک طریقۂ عبادت تھا۔ ملّت کی بخصوص تعمیری خدمت ان کی زندگی کا نصب العین تھا۔ بغیر کسی کی خوشامد کئے ہوئے، بغیر کسی کی خوشامد میں آئے ہوئے، بغیر کسی کے دباؤ میں آئے ہوئے بغیر کسی پر اپنا دباؤ ڈالے ہوئے، وہ ایک زندہ ضمیر کے ساتھ اسی خدمت میں لگے رہے سنسنی خیزی کے فن سے ناآشنا تھے۔ شریفوں کی پگڑی اچھالنا ان کے قلم نے جانا ہی نہیں خود شریف النفس تھے۔ شرافت پسند تھے۔ شرافت کی قدر و عزت ان کی نظر میں تھی اپنی قلمی صلاحیت کو دین و ملّت و ملک کی خدمت کے لئے وقف رکھا نہ زبردست سے ڈرے نہ زیردست کو ڈرایا۔ کیا ہندوستان اور کیا پاکستان، کم تر ہی صحافی اس معیار پر اتریں گے۔

اپنی ذات کے اچھالنے، چمکانے سے بیگانہ تھے۔ بڑی سے بڑی کمیٹیوں، مجلسوں تک رسائی ہی یورپ گئے امریکہ گئے۔ جاپان گئے۔ پرچہ پڑھنے والوں کو اس کا پتہ بھی نہ چلنے نہ دیا اپنی شخصیت کو نلائے وقت کے پردے میں تمام تر گم کر دیا تھا۔ اس خلاف اور اس بے نفسی کی مثالیں برطانیہ ہی کی اعلیٰ روزانہ صحافت (ٹائمز، یا آبزرور، گارجین وغیرہ ہی میں ملتی ہے[1])۔ اسلام پر زندہ رہے!

---

[1] یہاں جنگ انڈیا، کا مریڈ یا البلال کی مثالیں سامنے نہ لائیے۔ یہ خبر نامے نہ تھے بلکہ زندہ جریدے یا رسالے تھے شخصی مسلک و مذہب کی تبلیغ و اشاعت کے لئے۔

اسلامیت پر فخر کرتے رہے لیکن ان کا اسلام تعصب و تنگ نظری کا مرادف نہ بنا۔ بے تعصبی، فراخدلی، رواداری میں ان کا قلم ہر سیکولر صحافی کو سبق دے سکتا تھا۔ سب و شتم ذاتی طنز و تعریض، غلو و مبالغہ سے اپنا قلم کبھی آلودہ نہ ہونے دیا ـــــ موقع پرستی، ضمیر فروشی کے سمندر کے تلاطم خیز تھپیڑوں کے درمیان دیانت و بیداریٔ ضمیر کا یہ ایک ستون چٹان کی طرح مستحکم کھڑا ہوا تھا۔

صدق اور مدیر صدق کی ذات کے ساتھ جس درجہ کا تعلق اخلاص مرحوم کو تھا۔ اس کی مثالیں بھی زیادہ نہ ملیں گی، صدق اس لحاظ سے خوش قسمت ہے کہ اس کے حق و استحقاق سے کہیں بڑھ کر اس کی صحافی برادری کیا ہندوستان کی کیا پاکستان کی اس پر مہربان رہی ہے ۔ لیکن "نوائے وقت" اور صاحب نوائے وقت" کو اس عموم میں ایک مرتبہ خصوصی حاصل رہا ہے اور اس درجہ ارتباط و اختصاص میں اگر کوئی اس کی ہمسری کر سکتا ہے تو وہ حیدرآباد کا رہنمائے دکن (سابق رہبر دکن) ہے کہ اس نے بھی اپنے کالموں میں "نوائے وقت" ہی کی طرح صدق (اور رسالہ سچ) کی سچی باتیں اور شذرات کی نقل کا التزام ہر ہفتہ شروع ہی سے رکھا ہے ـــــ اور ایک راز کی سی بات بھی آج مرحوم کی وفات کے بعد سن لیجئے، اپریل ۱۹۵۰ء میں جب مجھے کراچی پہلی بار جانے کا اتفاق ہوا۔ تو راستے میں لاہور بھی پڑا۔ دوستوں نے دعوتیں کیں قیام کی آخری رات جب میں صبح سفر شروع ہو جانے والا تھا۔ تو بڑے پیمانہ پر دعوت اختر خاں مرحوم نے دفتر زمیندار میں کی نظامی بھی تھے۔ جب میں رخصت ہو کر سواری پر بیٹھنے لگا تو مرحوم نے چپکے سے ایک سربند لفافہ میرے سکریٹری کے ہاتھ میں دے دیا کہ اسے صبح مولانا کو دینا میں نے جب لفافہ حیرت کے ساتھ کھولا تو اس میں صدق کی اعانت کے لئے کئی سو کی رقم موجود تھی !

ایسے مخلص ہر ایک کو کہاں نصیب ہوتے ہیں !

مجھے بھی مرحوم کی شرافت و اخلاص پر وہ اعتماد تھا، جو کسی عزیز قریب پر ہوتا ہے۔ اسی فروری کے مہینہ میں ایک ضلع لاہور کے کسی دیہات سے کسی بڑے شکستہ حال پڑھے لکھے کا آیا۔ اپنی تنگ دستی کی مصیبت بیان کی۔ یہاں سے ان صاحب کی خدمت کی کوئی صورت ممکن نہ تھی۔ میں نے مرحوم ہی کو ان صاحب کا پتہ لکھ بھیجا، کہ ان کے حال پر توجہ کر دیجائے مرحوم کی وفات سے کل دس گیارہ دن پہلے کی ہی بات ہے۔

رمضان کی موت خوش نصیبوں ہی کو نصیب ہوتی ہے۔ اور پھر رمضان کا تیسرا عشرہ شروع ہونے پر! اور مرض الموت شروع جمعہ کی صبح سے ہوا! ٹھیک اسی وقت جب سحری کھا کر روزہ کی نیت کر چکے تھے! ——— جا قابل رشک روزہ دار مومن اور اپنے اللہ سے اجر بے حساب حاصل کر! مہلت تجھے بہت کم مل رہی تھی اور یار جنگ مرحوم بھی اسی سن میں اللہ کو پیارے ہو گئے تھے! لیکن اس مختصر مدت کو بھی تو نے بہتوں کی لمبی لمبی عمروں پر بھاری رکھا۔ تیری روح خود جنتی ہوئی شاداں و فرحاں رہے اور دوسروں کو اپنی یاد میں رلاتی تڑپاتی رہے!

سالک مرحوم

لاہور سے خبر آئی کہ ۲۰؍ستمبر ۱۹۵۹ء (اتوار) کے سہ پہر کو چار بجے لاہور ہی کے نہیں سارے پاکستان کے مشہور و معروف صحافی اور باغ و بہار ادیب و شاعر سالک صاحب حرکت قلب بند ہو جانے سے چند منٹ کے اندر رحلت فرما گئے۔ انا للہ۔ عمر ۶۴-۶۵ سال کی پائی۔

نام عبدالمجید خاں تھا۔ دنیا کے ذہن و حافظہ میں صرف سالک تھے (جیسا کہ ان کے قبل ایک نامور صحافی بجائے سید لبشارت علی کے صرف سید جالب دہلوی رہ گئے تھے) تازگی شادابی، شگفتگی اور سالک گویا لازم و ملزوم تھے۔ روزنامہ صحافت کی عمر ۳۰ سال کی پائی۔ اور روز بروز مشہور سے مشہور تر ہوتے گئے۔ روزنامہ زمیندار میں فکاہی کالم افکار و حوادث کے مستقل عنوان سے انھیں کی ایجاد تھا۔ اور دیکھتے دیکھتے ایک عالم ان کا مقلد بن گیا اور فکاہی کالم کسی نہ کسی عنوان سے ہر روزنامہ کے لئے ایک جزو لاینفک بن گیا۔ زمیندار سے الگ ہونے کے بعد اپنے رفیق کار مہر صاحب کے ساتھ مل کر اپنا ذاتی روزنامہ انقلاب نکالا اور دنیائے صحافت میں اپنا ایک مستقل مقام پیدا کر لیا۔ پابندی کے ساتھ ہر روز دستہ و شرافیانہ (؟) سخن کرتے رہنا۔ اور پھر اسے سالہا سال تک نباہ لے جانا آسان نہیں۔

۹؍اکتوبر ۱۹۵۹ء

سالک کی ذہنیت و فطانت نے اسی مشکل کو اپنے لئے آسان کر لیا ظرافت محض لفظی خوش طبعی اور تفریح و تفنن تک محدود و نہ تھی۔ بس میں پختگی کے ساتھ ساتھ اس میں حضرت اکبر الہ آبادی کی طرح، معنویت حکمت و معرفت کی آمیزش بھی برابر ہونے لگی تھی۔

شعر گوئی کی فرصت کم ملی لیکن شاعری جتنی بھی کی معیاری کی۔ زبان پر عبور اس درجہ حاصل تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ دہلی اور لکھنؤ کی صحبتیں دیکھے ہوئے ہیں۔ شاگرد رسا رامپوری کے تھے جو خود بڑی شوخ اور چلبلی طبیعت کے تھے اور زبان کے ایک ماہر استاد۔

آخر عمر کے کئی سال سنجیدہ تصنیف و تالیف میں گزارے اور سیاسی عنوانات کے علاوہ ایک ضخیم کتاب مسلمانوں کی تمدنی و ثقافتی تاریخ پر لکھ ڈالی۔ صدق و مدیر صدق سے گہرا اور پرانا خلوص رکھتے تھے اور حضرت اقبال کے بھی مخصوص نیازمندوں میں سے تھے۔

لاہور مولانا کی ذات سے خود ایک انجمن تھے ان کی وفات سے لاہور کی ساری علمی ادبی، شعری و اخباری فضا سونی ہو گئی۔

سارے ذہنی کمالات کے ساتھ پکے مذہبی شخص اور بڑے غیور مسلمان تھے۔ اللہ پاک ان کو مغفرت، رحمت و نوازش سے سرفراز فرمائے۔

شوکت تھانوی مرحوم[۱]

○

شوکت تھانوی کے ساتھ مرحوم کا الحاق کیسا عجیب سا معلوم ہو رہا ہے گویا اجتماع ضدین لیکن بالآخر جو ہونا تھا واقع ہو کر رہا! ــــــ زندگی اور زندہ دلی اگر کبھی مجسم ہو کر گوشت پوست کی شکل میں سامنے آسکتے تو وہ شاید شوکت تھانوی ہی ہوتے اور عجب کیا کہ زندہ دلی وظرافت کے ایک چھوٹے موٹے دیوتا مان لئے گئے ہوتے! موت کے بس سے اگر کسی کو باہر رہنا ممکن تھا تو ہماری کمیں کی دنیا میں ہی تھے۔ وقت آیا تو جس کے وجود کا جیسے مقصد ہی ہنسنا ہنسانا لوگوں کا دل خوش کرنا تھا خود ایک خاک کا ڈھیر تھا دوسروں کے لئے سرمایۂ ماتم سامانِ حسرت وغم!

پرانوں میں کسی نے انسان کی تعریف کی تھی کہ وہ حیوان ضاحک ہے عجب نہیں کہ انہیں سابقہ وقت کے کسی شوکت تھانوی سے پڑا ہو، لطیفہ گوئی، بذلہ سنجی میں اپنی نظیر آپ تھے ذہانت کا خزانہ آج کل کے محاورے میں بے پناہ تھا ــــــ انشاء کے لئے مشہور ہے کہ جب بادشاہ نے حکم دیا کہ ایک لطیفہ روز نیا سنایا کرو تو ہمت جواب دے گئی اور پسینہ آنے لگا ــــــ یہ فرمائش اگر شوکت تھانوی سے کی جاتی تو بے تکلف تیار ہو جاتے اور عمر چاہے سو سال کی ہو جاتی یہ ہر روز لا ناغہ نئی ہی سناتے رہتے۔ اپنے ضعیفہ میں اتنا حاضر دماغ میں نے دیکھا نہیں۔

---

[۱] صدقِ جدید، ۱۰ مئی ۱۹۶۳ء

خدا جانے کتنی کتابیں، کتنے رسالے، کتنے مضمون، کتنے خاکے لکھ ڈالے اور تھکن یا ماندگی کا پتا نہیں۔ ہر وقت آمد ہی آمد، آورد جیسے ان کی طبیعت جانتی ہی نہ تھی۔ دوسروں کو لکھ لکھ کر جو فیاضی اور اولوالعزمی سے دے دیتے تھے اس کا حساب الگ! اور آخر میں تو کئی سال سے ایک روزنامہ میں ہر روز لطائف گا کا کالم پوری لطافت کے ساتھ پورا کیا کرتے۔

یہ ہنسوڑپن تمام تر بے مقصد نہ ہوتا بلکہ ریڈیائی تقریریں ہوں یا اخباری تحریریں سب میں ہلکی پھلکی تعلیم و تبلیغ شریعت و شرافت کی ہوتی بلکہ کبھی کبھی تو عین دین و اخلاق کی بھی! خود بھی عقیدۃً پختہ مسلمان تھے۔ اور اعمال کی کوتاہیوں پر نادم و شرمسار آخر تھا نہ بھولنا ہی کے تو تھے۔

میخانہ کا محروم بھی محروم نہیں ہے!

جب پہلی بار فلمی دنیا میں قدم رکھا ہے تو مجھے خط میں لکھا میں ریڈیو سے گاتے گاتے اب فلم میں ناچنے بھی آ گیا ہوں"

یہ اعتراف خود سیاہیوں کو دھونے والا اور رحمتوں کو اپنی طرف کھینچنے والا ہے۔

سب سے پہلے شاید اودھ اخبار لکھنؤ کے ادارتی عملہ میں کام کیا پھر لکھنؤ کے دوسرے روزنامہ حق میں آ گئے۔ ایک اپنا رسالہ کائنات کے نام سے نکالا۔ سرپنچ لکھنؤ کے بھی مدیر رہے۔ شہرت کا پہلا قدم سودیشی ریل۔ لکھ کر اٹھایا۔ غالباً ۱۹۲۹ء میں اس کے بعد سے مشہور ہوتے چلے گئے۔ مرعوب نہ ترقی پسندی سے ہوتے نہ جدیدیت کے کسی اور رخ سے لکھنؤ ریڈیو میں ان منشی جی کی جانشینی قاضی جی کے حصہ میں آئی اور دونوں کی معصومانہ دلگیوں نے سامعین کو لوٹ لوٹ دیا ــــــ تھانوی محض نام کے تھے ورنہ اسکولی تعلیم لکھنؤ میں پائی۔ لڑکپن اور جوانی کا بیشتر زمانہ یہیں گزارا اس لئے زبان کے لحاظ سے پورے لکھنوی تھے۔ یہاں کے محاورہ اور روزمرہ پر عبور رکھنے والے۔ یہیں کی شستہ، رواں سلیس مستعلیق زبان لکھنے والے۔ خدائے آمرزگار لغزشوں کوتاہیوں سے درگزر فرمائے اور مرحوم کو کروٹ

کروٹ جنت نصیب فرمائے عمر شاید قریب ۵۵ کے پائی ہو. مرض (کینسر) سا موذی نصیب ہو۔ اس کی نا قابل بیان اذیتیں خود ہی کتنا بڑا سبب کفارہ ذنوب کا بن گئی ہوں گی. پھر سفر آخرت کے لیے ذی الحجہ کے متبرک عشرۂ اول میں بھی متبرک ترین تاریخ عین یوم الحج کی پائی یہ تاریخ کیا ملی، گویا غیبی بشارت مغفوریت کی ہاتھ آگئی. وما یلقٰھا الا ذو حظٍ عظیم۔

ڈاکٹر و طبیب

طبیب کی موت[1]

○

صبح تھی ۵ ۲ر دسمبر کی، اور وقت کوئی ۹ بجے کا، کہ خلقت کا ایک ہجوم موٹروں سے اور گاڑیوں سے اور تانگوں سے اور سائیکلوں سے اُتر کر پیدل رواں نظر آیا، لکھنؤ کے ایک مشہور محلّہ کی تنگ گلی میں۔ محلہ جھوائی ٹولہ شہر اور صوبہ کا مشہور دار الشفاء، دہلی کے بعد طبِّ یونانی کا مرکز و دار الحکومت، مریضوں اور زندگی کے مایوسوں کا قبلۂ اُمید۔ آج سے نہیں پُشتہا پُشت سے۔ اس وقت سے کہ جب کسی کے کان میں نام بھی نہیں پڑا تھا، کسی کے ذہن میں تصور بھی نہیں آیا تھا۔ وکٹوریہ ہاسپٹل کا کنگ جارج میڈیکل کالج کا![2] ——— مریضوں کے پھیرے گلی میں روز ہی لگے رہتے تھے، اور یہی وقت بھی ہوتا تھا آج کے مجمع کا رنگ سب دنوں سے الگ تھا۔ آج قدم اٹھ رہے تھے افسردگی سے، دل پگھل رہے تھے عبرت کی گرمیوں سے۔ آج نبض دکھانی نہ تھی۔ نسخہ لکھانا نہ تھا۔ جو حکیم صاحب کا جنازہ پڑھنا تھا۔ قبر میں اُتارنا تھا اور وہ جو دوسروں کے جسم کا محافظ سمجھا جاتا تھا خود اس کے جسم کو ایک گہرے گڑھے میں دفن کرنا، تربت پر فاتحہ پڑھنا! ——— طبیب موت کے منہ میں چارہ گر قضا کے شکنجہ میں! تقدیر سے تدبیر کی شکست کی بے شمار مثالوں، میں لا تعداد نظیروں میں ایک اور اضافہ!

⁂

---

[1] صدق، ۳ر جنوری ۱۹۳۱ء

[2] اُس وقت کے دو مشہور اسپتالوں کے نام۔

طبیب ابن طبیب، حاذقوں کی اولاد، حاذق کے بیٹے، حاذق کے پوتے شفاء الملک حکیم عبدالحمید لکھنوی محتاج نہ تعریف کے نہ تعارف کے مشہور طبی درس گاہ تکمیل الطب کے روح رواں، اچھی خاصی صحت، سرخ وسفید چہرہ تندرست بشرہ، ابھی اس ادویں کو دوا پلا رہے ہیں، ابھی اُس لب مرگ کو خدا کے حکم سے جلا رہے ہیں کہ یک بیک خود بیمار پڑے، ذیابطیس اور پھر دق، بیماری گھیرے اور آئے، علاج یہ ہوا اور وہ، اور انجام آخر وہی ہوا جو اس کشمکش کا ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے۔ جو علاج دوسروں کا کر رہا تھا خود اس کا مرض لا علاج نکلا، جو داستان گوئی کے لئے مشہور تھا پلک جھپکتے ہی خود اس کی زندگی افسانہ بن گئی رہ گئی! طب کی کتابیں ازبر کر لینے سے کیا انسان آئی ہوئی گھڑی کے آگے پیچھے کر دینے پر کچھ بھی قدرت حاصل کر لیتا ہے؟ دواؤں کو پہچان لینے، بیماریوں کا نام جان لینے مرض کی اصطلاحیں یاد کر لینے سے کیا مرگ وفنا کے قانون کی گرفت ایک ذرہ بھی ہلکی ہو جاتی ہے؟ کاٹھ کی پتلیوں کو کپڑے جس کے چاہے پہنا دیجئے، نام بادشاہ وزیر، کوتوال، فراش، بہشتی، دربان جو چاہے رکھ دیجئے، قوت ساری کی ساری کل کٹھ پتلی والے کے تار اور اس کی مشیت کے ہاتھ میں ہے! زرق برق لباس والی مختلف شاندار ناموں والی کٹھ پتلیاں بھی اس میں کسی درجہ میں شریک ہیں۔ اختیار اور قوت سے متعلق پردے کیسے کیسے پڑے ہوئے ہیں! بچے کس معصومیت کے ساتھ بادشاہ اور وزیر اور رکیا کیا اُن پتلیوں ہی کو یقین کئے ہوئے ہیں۔!

÷ ———— ÷ ———— ÷

انتقال سے چند روز قبل عیادت کا اتفاق چند منٹ کے لئے ہوا چہرہ پر نور اور نادر اگرچہ کھلتے جاتے تھے اور ڈھلتے جاتے تھے۔ ۔ ۔ ۔ لب پر اپریل رہے تھے نازکی! پابندی سادگی اور آخر عمر میں حج وزیارت، آخر بے نتیجہ تھوڑے ہی رہ سکتی تھیں؟ اور پھر بالکل آخر میں موت سے کچھ ہی روز قبل ایک دو، کامل کی نظر عنایت وشفقت اور اس کے ہاتھ پر بیعت عبادت کا یہ ادوتی اس بیعت پر مبارک باد دینے میں صرف ہوا ———— استغفار اور بیعت

ایسے وقت میں جب کسی نئی معصیت میں مبتلا ہونے کا کوئی موقع ہی نہیں اور مجاہدات اضطرا[ری]
ہیں کہ ساعت بہ ساعت طے ہوتے جا رہے ہیں! اور مرشد کامل کی توجہ خاص اس پر مستزاد
حسن انجام کی پیش خبری اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے؟ اللہم اغفرلہ وارحمہ

آج سے ۲۴ سال قبل ۱۹۱۲ء میں ترکی پر دشمنوں کی یورش تھی جنگ طرابلس ا[بھی]
پوری طرح ختم نہیں ہونے پائی تھی کہ بلقان کی چھوٹی بڑی ساری سلطنتیں یلغار کرکے تر[کی]
پر ٹوٹ پڑیں۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری کا نام دنیا نے اول اول اسوقت سنا اور چن[د]
ہی روز میں لوگ پورا نام تو بھول بھال گئے زبانوں پر صرف "ڈاکٹر انصاری" ہی چڑھا [رہا]
محمد علیؒ کی تحریک پر طبی وفد لے کر ترکی گئے، کامریڈ میں ہر ہفتہ ذکر خیر ہوتا رہا۔ محمد علیؒ کی [زبان]
و قلم دونوں ان کی تائید کے لئے وقف تھے۔ وہ دن اور آج، اس بہادر کا قدم، قوم[ی خدمت]
کے میدان میں پیچھے نہ ہٹا۔ تا آنکہ ۱۰ مئی کو اپنی مدت حیات عالم ناسوت میں پوری کر[کے]
رب کے حضور میں بلا لئے گئے۔ اللہ نے دولت وافر دی تھی، دست کرم کی فیاضیاں
اس سے بھی بڑھ چڑھ کر تھیں، لاکھوں ہی لوگوں کے کھلانے پلانے میں، غریبوں کی مد[د]
میں اٹھا دیئے، لق و دق کوٹھی، ایک مستقل مہمان سرا تھی جب دیکھئے مہمانوں سے بھری

---

[1] منقول از صدق ۱۷ مئی ۱۹۳۶ء

جو صاحب اسٹیشن پر آتے، بس سیدھے ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی کا رخ کر دیا۔ قوم وملت کے پیچھے ہر طرح کے دُکھ درد اٹھائے۔ آمدنی کا نقصان گوارہ کیا۔ جیل گئے سب کچھ ہوا مگر اپنی آن میں فرق نہ آنے دیا۔ تحریک خلافت کے شباب میں، خلافت کے لئے خوب خوب کام کئے۔ جامعہ ملیہ کی سرپرستی آخر دم تک قائم رکھی۔ جوان سے بوڑھے ہوئے لیکن ہمت بدستور جوان ہی رہی۔ قوائے جسمانی ضعیف ہوئے لیکن قومی خدمت گزاری کی قوت اور ولولہ میں کوئی فرق نہ آیا۔ ۱۰ مئی کی صبح بھی قیامت کی صبح تھی! صدہا مریض آس لگائے بیٹھے تھے کہ مسیحائے وقت سے دوا لیں گے، نسخہ لکھائیں گے بجائے اس طبیب حاذق کے ٹرین سے طبیب کی لاش آئی! آہ انسانی آرزوؤں کی پامالی! انسان اُمید کیا لگاتا ہے اور ہو کر کیا رہتا ہے؟ اور آہ بشری کمالات کی بے حقیقتی جو دوسروں کی زندگی کا سہارا سمجھا جاتا تھا، اپنے آئے ہوئے وقت کو ایک منٹ کے لئے نہ ٹال سکا! حق تعالیٰ درجہ عالیہ نصیب فرمائیں۔

~~~

~~~

ڈاکٹر صاحب

باہر کے لوگ تو نسبتہً کم واقف تھے لیکن لکھنؤ کے مسلمانوں کو تو یقیناً یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ڈاکٹر حکیم مولانا سید عبدالعلی ـــــ آہ کہ پہلی دفعہ انھیں مرحوم لکھنا پڑ رہا ہے کیا شخصیت تھی!

ناظم ندوہ تھے اور علم و فضل اور فن طبابت کی طرح کہنا چاہئے کہ یہ نظامت ندوہ بھی موروثی ہی تھی۔ مرحوم کے والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب (صاحب نزہۃ الخواطر طبیب الحائر و تذکرہ گل رعنا وغیرہ) ایک فاضل اجل اور سخن سنج بے بدل اور طبیب حاذق ہونے کے ساتھ ناظم ندوہ بھی مدت تک رہے۔ ڈاکٹر عبدالعلی صاحب وہم بے تکلف نیاز مندوں کی زبان پر صرف "ڈاکٹر صاحب" نے فن طب اور علوم دین کی تکمیل کے بعد لکھنؤ یونیورسٹی سے بی۔ ایس۔ سی۔ کر لیا۔ (اور باٹنی یا نباتیات کے مضمون میں غالباً امتیازی نمبر حاصل کئے) اور پھر لکھنؤ میڈیکل کالج سے ایم۔ بی۔ بی۔ ایس۔ کی ڈگری بھی حاصل کر لی اور ہومیوپیتھ طریق علاج میں بھی دستگاہ حاصل کر لی اور مریضوں کی خدمت کو اپنا شعار بنا لیا۔ اللہ نے ہاتھ میں شفا ایسی رکھ دی تھی کہ بس! اپنا ذاتی تجربہ ایک آدھ بار کا نہیں بار ہا کا ہے کہ بڑی سے بڑی تکلیف کے وقت ادھر ڈاکٹر صاحب کو دکھایا اور ادھر بیماری رخصت کبھی کبھی دوا کی ایک ہی خوراک سے

صدق جدید ۱۹ رمئی سنہ ۶۱ء

بےنفس، نہایت درجہ خاموش، متین، مسکین، ذی مروت، قانع، متواضع، بے آزار
...ور خلوت پسند تھے کم گوئی اور کم سخنی کا اثر پیشہ پر بھی پڑا اور جب کہ مقابلہ میں بہتوں
...ے ہاں طراری اور خوش بیانی خاص جوہر تھے لیکن اس اللہ کے بندے نے اپنی وضع
...ں ذرا فرق نہ آنے دیا۔ ندوہ سے فارغ ہونے کے بعد حدیث کی تکمیل دیوبند جاکر کی تھی
...ور شروع میں خود بھی کچھ دن حدیث کا درس دیتے رہے باقی عبادت الٰہی کا مستقل
...ند زندگی تھی لمبی گھنی داڑھی دیکھ کر جو نا بناک چہرے کے ساتھ اب خود بھی بالکل سفید
...وگئی تھی کسی کو گمان بھی نہ گزرتا کہ یہ انگریزی جانتے ہیں، چہ جائیکہ اتنی ڈگریاں پائے
...ئے۔

سادگی میں اپنی نظیر آپ تھے اور حلم تو اس درجہ تھا کہ شاید اپنے کسی ملازم پر
...ی بھی آواز نہ بلند کی ہو۔

مسلک اتباع حدیث تھا لیکن حنفیوں سے شیر و شکر اور ایک حنفی ہی شیخ طریقت
...ولانا حسین احمد مدنی) کے مرید، سیاسیات سے بے تعلق تھے لیکن محض شیخ کے اتباع
...ں ووٹ جاکر لمشنامٹ بکس میں ڈال آئے ـــــ مطب کی مصروفیت سے جتنا بھی
...ت بچتا ندوہ کی خدمت میں صرف کرتے، عبادت الٰہی اور خدمت خلق بس یہی دو مشغلے
...گئے تھے۔ اور یہی مشغلے ہر سیر و تفریح کے قائم مقام۔

اخلاص ہر ایک کے ساتھ اور پرانے نیازمندوں کے حق میں تو بھائی ہی کی طرح
...ق و شفیق۔ ادھر ایک عرصہ دراز سے صحت بہت خراب ہو گئی تھی (بلڈ پریشر
...ار الدم) وغیرہ کے دورے بار بار پڑنے لگے تھے غذا پہلے ہی بہت سادہ تھی اور اب تو
...بیز کی رعایت سے گویا رہبانہ ہو کر رہ گئی تھی مطب کا کام کئی مہینے سے چھوٹ گیا
...جب تک محتاج کرتے رہے ہیں تو ہر طرف سے سلسلہ نیاز توڑتے ہوئے ایک بھی
...ن پکڑے ہوئے تھا۔ لکھنؤ میں متعدد ممتاز طبیب ڈاکٹر اور ہومیو پیتھ میرے مخلص

میں ہیں۔ بعض تو عزیز قریب ہی میں لیکن ان کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے کی ضرورت
—— علاج کے وقت اسمِ الشافی کے خاص مظہر۔

ایک آدھ دورہ ادھر سخت قسم کا پڑا تھا کہ ۲ مئی (یکشنبہ) کی دوپہر کو چاہ
بشاش اپنے معالج ڈاکٹر سے ہاتھ ملاتے ملاتے آناً فاناً اپنے مولا کے حضور حاضر ہو گئے۔
میری قسمت میں شاید دوستوں، رفیقوں، مخلصوں کا ماتم ہی کرنا ہے۔ مولانا عبدالرحم
ندوی نگرامی کو تو اب خیر ایک قرن گزر چکا۔ باقی علامہ سید سلیمان ندوی اور مولا
مناظر احسن گیلانی دونوں دیکھتے دیکھتے داغ مفارقت دے گئے اور اب تازہ د
ان ڈاکٹر صاحب کا کھانا پڑا ہے —— مرگ مومن کی حقیقت کوئی کیا
لفظوں میں بیان کرے لیکن بہر حال جذبات و تعلقات کا پاس بھی اس عالم آب و گ
میں لازمی ہے۔ ملت کے مشہور خادم و مخدوم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نائب
ندوۃ العلماء مرحوم کے بھائی ہیں۔ سن میں ان سے بہت چھوٹے اور دوسری والدہ
سید احمد شہید رائے بریلوی کے خاندان کے نام لیوا۔ اللہ مغفرت بال بال اور د
کروٹ کروٹ نصیب فرمائے۔

شفاء الملک

حکیم حافظ خواجہ شمس الدین لکھنوی

میرا آبائی وطن قصبہ دریاباد شہر لکھنؤ سے کوئی ۷۷ میل جانب مشرق فیض آباد کی طرف واقع ہے
نیم وطن کی حیثیت شہر لکھنؤ کو کم سے کم تین پشتوں سے تو حاصل ہے ۔ میرے نانا مولوی حکیم نور کریم
میرے دادا بھی تھے، کی پوری عمر لکھنؤ میں گزری اور ان کا شمار علماء شہر میں تھا ۔ دادا صاحب
مظہر کریم کی بھی تعلیم فرنگی محل میں ہوئی ۔ اور والد اور والدہ دونوں کی پیدائش غالباً لکھنؤ ہی
ہوئی شہر میں دو خاندان ایسے تھے جن سے تعلقات دوستانہ سے بڑھ کر عزیزانہ تھے ۔ ایک
دان فرنگی محل جس سے یگانگت بالکل عزیز داری کی سی تھی اور دادا صاحب بیعت بھی یہیں
کے ۔ اس سے اتر کر خاندان جھوائی ٹولہ کے اطبا کا تھا نانا صاحب کو انھیں لوگوں نے طبیب
بڑھا کر طبیب گر کا لقب دے رکھا تھا ۔ ان دو کے بعد ایک تیسرا خاندان اور تھا جس
ابطہ اتنا قدیم تو نہیں تھا پھر بھی اچھا خاصہ قدیم رہا ہے ۔ اس کے رکن اعلیٰ ایک پشت قبل
قطب الدین احمد تھے ۔ ان کا کاروبار کتابوں کا تھا اور ان کا پریس نامی بڑے نام نہیں

جدید ۱۴/ مئی ۱۹۲۱ء

واقعی اپنے زمانہ میں نامی تھا۔ یہ میرے والد صاحب کے معاصرین میں تھے اور گھر کے مذہبی آدمی تھے۔ لکھنؤ کے طبیب گرامی حکیم خواجہ شمس الدین ان ہی کے نامور فرزند تھے۔ اور لکھنؤ میں فن طب کی آخری آبرو جمعرات ۲۹ اپریل (۳ ربیع الاول ۱۳۹۱ھ) کو ۷۵ اور ۸۰ کے درمیان عمر پاکر وفات پائی۔ اور طب یونانی کے قدر دانوں کو روتا اور سوگ مناتا چھوڑ گئے۔

میرے ذاتی تعلقات بھی ۴۰-۴۵ سال سے تھے۔ میرے خالہ زاد بھائی شفاء الملک حکیم عبدالحسیب دریابادی (متوفی ۱۹۵۰ء) لکھنؤ کے ایک نامور طبیب تھے۔ انھیں "محسن الطب" کا لقب ملک سے انھیں حکیم شمس الدین مرحوم نے دلایا تھا۔ ان کے پاس محلہ گھسیاری منڈی میں حکیم صاحب اکثر آمد و رفت رکھتے۔ وہیں ملاقات ہوئی اور رفتہ رفتہ مرحوم کے جوہر ایسے کھلے کہ میں ان کے کمالات کا شیفتہ و گرویدہ ہو گیا۔ اور انھوں نے فرط کرم و حسن ظن سے تو میرے لیے ایک بڑا ہی مبالغہ آمیز نام تراش لیا تھا۔

لکھنؤ میں حاذق طبیب اور کامیاب معالج دوسرے دوسرے بھی موجود تھے اور بہت سے چھوٹے بڑے والوں میں۔ لیکن جو مقبولیت خاص و عام ہر طبقہ میں ان حکیم صاحب کو غیر معمولی حد تک نصیب ہوئی اس کے لحاظ سے اپنی نظیر آپ ہی تھے۔ ایوان گورنری سے لے کر رکشا والوں تک جس طبیب کا نام بے تکلف زبانوں پر چڑھا ہوا تھا اور باہر سے لوگ اس کثرت سے جس کے پاس علاج کرانے آتے تھے وہ حکیم شمس الدین ہی تھے۔ حالانکہ مرحوم علاج میں نرم نہ تھے سخت تھے پرہیز بڑا کڑا کراتے تھے اور مریض کے ساتھ مروت کے قائل بالکل نہ تھے۔

حکیم صاحب حافظ قرآن تھے اور قرآن خوب یاد تھا۔ ہر سال محراب پابندی سے سناتے تھے۔ عربی درسیات کی تکمیل مدرسہ نظامیہ فرنگی محل سے کی تھی۔ اور مشہور عالم مولانا عبدالباری فرنگی محلی سے نہ صرف علوم میں شاگردی حاصل کی بلکہ تصوف میں بیعت بھی ان ہی سے قادری سلسلہ میں کی۔ اور اذکار کے شدت سے پابند تھے۔ عمر بھر ذاکر و شاغل رہے۔ اور آخری کئی

سال تو شاہ وصی اللہ رحمۃ اللہ خلیفہ حضرت تھانوی کی صحبت و تربیت میں گزارے۔ اس سے وہ ذوق تصوف اور زیادہ نکھر آیا۔

غذا میں سادگی کو مجاہدہ کی حد تک پہنچا دیا تھا بجز دو وقت اور شوربا چپاتی کے سوا اور کچھ نہ کھاتے۔ لکھنؤ میں رہ کر اور خوش حالی کے باوجود نہ انھیں عام خربوزوں سے کوئی واسطہ نہ شیرمال و تافتان سے نہ حلوے مربے سے دعوت میں جاتے پارٹیوں میں شریک ہوتے پھلوں اور مٹھائیوں سے لدی ہوئی میزیں اور متنجن و زعفر سے بھرے ہوئے دسترخوان بھی آنکھ سے دیکھ کر چلے آتے۔ انھیں نہ ان سے اور نہ دوسری نعمتوں سے کوئی واسطہ تھا۔ مجھے ان کے اس دائمی پرہیز کو دیکھ کر اردو میں ایک نئے لفظ کا اضافہ کرنا پڑا اور وہ ہے "پرہیز سالار" (گار نہیں صرف سالار) یہ سن کر خوب ہنسے۔

میری تعبیر کے قائل بہت ہی زائد تھے۔ جب بھی ذکر کرتے تو اپنی آنکھیں نیچی ہو جاتی تھیں اور ایک آدھ بار تو اتنا آگے بڑھ گئے کہ مجھے ذرا صفائی سے بالکل روک دینا پڑا۔

——— دوسرے شفاء الملک حکیم عبد اللطیف مرحوم بھی کچھ ایسا ہی حسن ظن اپنے کرم و التفات کے ساتھ رکھتے لیکن وہ بہر حال حدود کے اندر رہتے یہ حکیم شمس الدین صاحب ان سے بالکل الگ مرفوع القلم کے درجہ میں پہنچ جاتے تھے۔

خدا لگی سادگی کی طرح پیدل چلنے (مشی) کے بھی بڑے پابند تھے۔ جوانی بھر تو میلوں چلتے رہے اور خوب تیز، ایک دفعہ علی گڑھ کے سفر میں کسی چھوٹے اسٹیشن پر کسی ضرورت سے اترے اتنے میں گاڑی چل دی اور پلیٹ فارم چھوڑ دیا۔ حکیم صاحب بے اختیار دوڑے اور بالآخر گاڑی پکڑ لی ——— اب نہ اتنی مسافت روزانہ طے کرتے تھے اور نہ اتنا تیز چلتے تھے پھر بھی چلنے کی عادت جاری رہی۔ اور برسوں موٹر رکھا جب بھی یہ عادت نہ چھوڑی۔

لباس بڑا سادہ پہنتے اور خاص لکھنؤی وضع کا انگرکھا دو پلی ٹوپی پہن کر نکلنے والے اب کتنے کم رہ گئے ہیں۔ ان ہی چند میں ایک حکیم صاحب بھی تھے۔ بات چیت

نشست و برخاست، چال ڈھال سب سے مشرقیت لکھنؤیت نمایاں، مستعدی اور کارکردگی تو جیسے ان کی ذات پر ختم تھی۔ تڑ تڑا بھی یہ کام کیا ابھی وہ۔ ابھی یہاں تھے ابھی دم بھر میں وہاں پہونچ گئے۔ ظریف الملک شوکت تھانوی کہا کرتے تھے کہ اللہ میاں نے سب کو مٹی سے پیدا کیا مگر حکیم صاحب کی تخلیق میں ایک عنصر بجلی کا بھی ملا دیا۔

بولنے والے بھی اچھے تھے ایک رسالہ بھی فن خطابت پر لکھ دیا تھا۔ عربی زبان پر عبور تھا۔ اردو شعر و ادب کا بھی بڑا ذوق رکھتے تھے۔ متعدد سرکاری و نیم سرکاری کمیٹیوں کے بھی ممبر رہے۔ مثلاً یو پی انڈین میڈیسن بورڈ، ریلوے کی مشورتی کمیٹی بعض ملی کمیٹیاں اور مجلسیں اس کے علاوہ مثلاً ندوہ کی انتظامی کمیٹی۔ انجمن اصلاح المسلمین وغیرہ سالہا سال لکھنؤ میونسپل کمیٹی کے بھی ممبر رہے۔ ایک بار کیا ہوا کہ حکیم صاحب جب میونسپل ممبری کے لئے کھڑے ہوئے تو لکھنؤ کے دل لگی بازوں نے حکیم صاحب سے چشمک کی بنا پر چوک کی ایک بالانشین کو بھی مقابلہ پر مجبور کر دیا۔ مسماۃ کا نام دلربا تھا حکیم صاحب بھلا ہارنے والے تھے، عین الکشن کے دن ایک بند تصنیف کر کے لڑکوں کو یاد کرا دیا ٹیپ کا مصرعہ تھا سہ

دیجئے دل دلربا کو ووٹ شمس الدین کو

اور لڑکوں نے مصرعہ ثانی کے آخری ٹکڑے کو ایسا چیخ چیخ کر گایا کہ ساری فضا ووٹ شمس الدین کو، ووٹ شمس الدین کو سے گونج گئی۔ حکیم صاحب کا نسخہ تیر بہدف نکلا۔ اور انھیں نمایاں کامیابی نصیب ہوئی اور مسماۃ اپنی ناکامی کے بعد حکیم صاحب کو مبارکباد دینے آئیں اور چلتے چلتے چوٹ بھی حکیم صاحب پر لکھنؤ کے لطیف و بلیغ انداز میں کر گئیں " لونڈی کو بھلا مقابلہ کی کیا مجال تھی اچھا ہوا، جو ہوا، یہی ہونا تھا۔ لیکن باہر کی دنیا کیا کہے گی یہی کہے گی کہ لکھنؤ میں مرد کم ہیں، مریض زیادہ۔"

بے طمعی، وضعداری، اخلاص خاص جوہر تھے۔ کثرت سے مریضوں کو دوا مفت تک مفت دیتے تھے ایک جواہر مہرہ خاص محنت و ترکیب کے ساتھ تیار کیا تھا۔ بڑا مجرب اور

موثر۔ اس کی شیشیوں پر شیشیاں دوست احباب کے لئے بلا قیمت وقف تھیں۔ طب کے جراثمی میں جو شہرت تھی ویسی ہی دستگاہ حرز علمی میں بھی تھی۔ پڑھاتے تو خوب تھے اور زنانون ٹیلے کے تو گویا ماہر تھے۔ پیغمبروں کے فقرے زبانی یاد تھے اور اس فن کے بعد پھر ذوق شعر وادب سے تھا۔ عربی وفارسی اور ان دونوں سے بڑھ کر اردو شعر وادب کا۔ لکھنؤ کا ایک خصوصی فن ضلع جگت ہے۔ اس میں بھی یہ اسلامیت، مشرقیت و لکھنویت کا پیکر بے بدل تھا۔

بیمار ہوئے اور مدتوں بیماری کی ہر شدت جھیلی علاج میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رہا کینسر کے شبہ میں تشخیص کرانے حکیم صاحب بمبئی گئے اور جانچ ہی کے طریقوں کی کثرت نے عاجز کر دیا۔ پھر بہترین علاج لکھنؤ میں بھی ہوتا رہا۔ آخر میں نطق بالکل جاتا رہا۔ لکھنے پڑھنے سے معذور تو معذول ہو گئے تھے اب بات چیت کے لئے محض اشاروں کا سہارا تھا۔ منظر کس درجہ عبرت کا تھا۔ وقت کا حاذق ترین طبیب کرب سے تڑپ رہا ہے۔ فن نہ اپنا کام دے رہا ہے نہ اپنے کسی نامور ہم فن کا۔ خود جو ایک بہترین خطیب وادیب تھا وہ منہ سے دو ایک موزوں کلمہ نکالنے کے بجائے بے کسی کی تصویر بنا ہوا دوسروں کا منہ تکتا تھا۔ کیا شان بے نیازی ہے اور عبدیت کے مرحلے کس کس طرح طے ہوتے ہیں ایک اسی شہر کے شفاء الملک حکیم عبد اللطیف تھے جو ابھی چند مہینے قبل ایسی بجلی کی تیزی سے رخصت ہوئے کہ ساعت موعود کا اندازہ ایک منٹ قبل بھی خود نہ کر سکے۔ نہ پاس بیٹھے ہوئے شاگرد اور معالج ڈاکٹر۔ اور اب دوسرے شفاء الملک یہ تھے کہ بالکل اس کے مقابل خوب ہی کرب کے ایک ایک جزیہ کا ادراک کرایا جاتا ——— اور دنیا نے جسے شفاء الملک کہہ کر پکارا تھا۔ وہ اپنے نفس نفیس کی شفا پر بھی قادر نہ ہو سکا۔ اور ہزاروں کو اپنا سوگوار چھوڑ کر جنت کی بے شمار نعمتوں اور بے حساب لذتوں کے شوق میں اس دنیائے دنی وفانی سے رخصت ہو گیا۔ اللہ اس کی گور کو اپنی رحمتوں سے مالامال کر دے۔

دیگر حضرات

شیخ خبدار
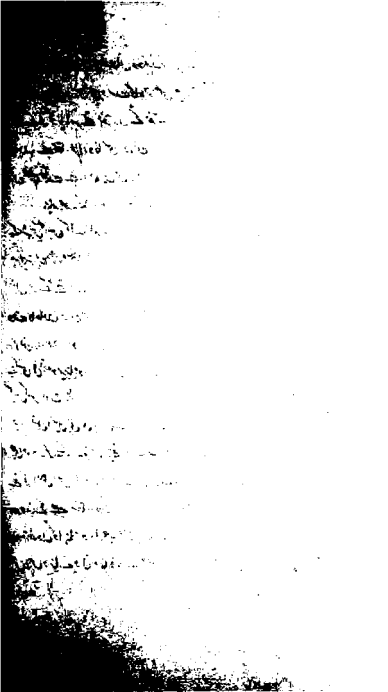
نام فرضی نہیں اصلی ہے۔ ابھی گزرے ہوئے دن ہی کتنے ہوئے، مئی ۴۱ء ہی کی بات ہے
اسی لکھنؤ میں رہتے تھے۔ دفتر صدق کے پچھواڑے اور صدق نویس کے لکھنؤی مکان کے مقابل۔ عالم
نہ فاضل، واعظ نہ خطیب، شاعر نہ ادیب، ٹکسٹی کے ایک معمولی دوکاندار، کم سواد، کم استعداد،
ڈیل ڈول کے اچھے، جسم کے گٹھے کٹے۔ معمر ہو کر وفات پائی شہید گنج قبرستان عیش باغ (نام بھی کتنا
بلیغ ہے) میں جگہ پائی۔ دن گزرے، مہینے گزرے، کچی قبر کی بساط ہی کیا، پھر زوروں کی برسات پانی
سما رہا لحد کے اوپر ہوا اور لحد کے اندر ہوا قبر بیٹھ گئی، جون، جولائی، اگست، ستمبر پوری برسات
کھا پینے کے بعد کہیں نومبر دسمبر میں وارثوں کو قبر کی مرمت کا خیال آیا کوئی سات مہینے ہو چکے تھے مزدور
نے کہا کہ قبر کو نیچے سے ٹھیک کرنا ہوگا، مٹی سارا ڈھیر کھود ڈالا گیا اور کھولا گیا، تختوں کے نیچے سے نمودار
سو کھی ہوئی ہڈیاں یا ان کا پنجر نہیں بلکہ اصل لاش جوں کی توں! ——— ایک پیر سے
کفن ذرا سرکا ہوا تھا، انگوٹھے پر کے بال، تلوے کی جھریاں، پشت پا کے گٹھے تک ہلکا ایک خطا
خواہاں بدستور! اللہ اکبر!

سات مہینے کی مدت کوئی تھوڑی ہوتی ہے! اور وہ بھی پوری برسات گزار کے ہوئے! —
جسم کو سڑانے اور گلانے کیلئے تو چند دن کا وقفہ بھی بہت ہے ——— اس پر بھی نعش نہ سڑتی
ہے نہ گلتی ہے، کفن بھی تک اسی حال پر قائم ہے، عطر کے دھبے اسی طرح پڑے ہوئے ہیں فرق
صرف اتنا ہے کہ پانی کے اثر سے پھیل زیادہ گئے ہیں، خوشبو کا فقدان اور عطر کی اسی وقت تک

(صدق ۱۳ نومبر ۱۹۴۲ء)

تاہم، قبر کھولتے وقت نہ سڑاہند محسوس ہوئی اور نہ بھبک آئی ناک میں وہی خوشبو عطر سافور کی
آئی گویا تازہ میت کی تازہ خوشبو ہو ۔ تختے دو ایک ٹوٹ کر قبر کے اندر گر چکے تھے، چاہیے یہ
تھا کہ میت کو گزند پہنچتا اندر پانی کے اثر سے نعش اور زیادہ اندر کو دھنس جاتی ہوا اس کے برعکس
نعش ہر طرح کے گزند سے محفوظ ہی نہیں رہی پانی کے اثر سے نیچے کی مٹی اوپر کو سرک آئی اور نعش بلند تر
ہو کر سطح زمین کے قریب آگئی! ـــــ قیاس اور اندازے سارے کے سارے غلط نکلے اور جو گھلنے
مٹنے اور فنا ہونے کیلئے ہی تھا اس میں آثار اور جلوے فانی کے نہیں باقی کے پیدا ہو گئے ۔

میت عالم فاضل کی نہ تھی، واعظ و مدرس کی نہ تھی ۔ مسجد کے موذن کی تھی، نماز کیلئے
بلانے والے کی تھی، موذنی تنخواہ کے معاوضہ میں نہیں اجر کی طمع میں، جنت کی حرص میں رات
کے سے اٹھتے، تہجد فرض نماز کی پابندی کی طرح اہتمام سے ادا کرتے پھر مسجد کیلئے نکل کھڑے
ہوتے اور جاڑے ہوتے تو نمازیوں کیلئے پانی گرم کرتے اذان اس جوش اور کڑک کے ساتھ
دیتے کہ دور دور تک سونے والے بیدار ہو جاتے اور پھر محلہ میں گشت کر کر کے نمازیوں کو مسجد کی
طرف لاتے ۔ نماز رات کی ہو یا کسی وقت کی، بس یہی معمول ہو گیا تھا، سنا ہے کہ جان بھی اسی حالت
میں دی کہ بیٹھے بیٹھے نماز ہی کے لئے نیت کرنے کے بعد ہاتھ باندھ چکے تھے، عمر بھر کی کمائی کہیں
بیکار جا سکتی تھی یا اللہ کے نام کی پکار ضائع ہو سکتی تھی؟ اللہ کے نام کو روز فضائے ہوائی میں بلند
[illegible] ونشر کرنے والا کیسے لطف و التفات سے محروم رہ سکتا ہے؟ غیب میں جو کچھ بھی
ہو آتی شہادت تو ہم ناسوتیوں کی آنکھیں دیکھ رہی ہیں اور یہی ناسوتی جسم کے کان ابھی کل اللہ اکبر
کی صداؤں سے گونج رہے تھے، پانی اور مٹی کے طبعی اثرات بالکل بے کار کر دیے گئے کہ ایمان والے
کی نعش کی احترام کا قانون بلند ہوا اور روشن ہوا اسی بیسویں صدی کی مادی دنیا میں! ـ

ایک قدیم ترین مخلص کی وفات[1]

وہ صدق کے خریدار ہی نہیں قدردان اور گہرے قدردان اس وقت سے تھے جب وہ سچ کے نام سے اوّل اوّل ۱۹۲۵ء میں نکلا تھا اور مرحوم غالباً ۲۶ء ہی سے اس کی طرف متوجہ ہوگئے تھے اور اس کے شذروں اور مضمونوں کا ترجمہ اپنی مادری زبان گجراتی میں کرکے مسلم گجرات (یا کسی اور نام کے ہفتہ وار) میں شائع کرانے لگے تھے۔

گجرات کی میمن برادری کے تھے نام احمد تھا۔ اور قلمی نام غریب۔ گجراتی پریس میں اسی نام سے لکھتے تھے اور اپنی زبان کے ممتاز لکھنے والوں میں شمار ہوتے تھے ۵ / جولائی کا بمبئی سے لکھا ہوا خط ۷ / کی شام کو موصول ہوا کہ یوم جمعہ کو شب میں دفعتہً انتقال کیا۔ اِنّا لِلّٰہِ وَ اِنّا اِلیہِ رَاجِعُونَ۔

بمبئی میں اور بھائیوں کی شرکت میں گھڑی (چھتری) کا نٹے چمچے) کا کاروبار اچھے پیمانہ پر کرتے تھے تجارتی کاروبار کے ساتھ بڑے دیندار تھے اور ان کی دینداری لازمی نہیں متعدی تھی ہر دینی دملّی کام میں پیش پیش رہتے حج خدا معلوم کتنے کئے اور دوسروں کو کرائے۔ انجمن خدام النبی کے خاص کارکن تھے اور حاجیوں کی خدمت گویا اپنی زندگی کا مقصد بنائے ہوئے، ماہ نامہ البلاغ گویا انھیں کا تھا حاجیوں کے لئے کتابچے اور رسالے بھی لکھ لکھ کر چھپواتے رہتے۔

---

[1] منقول از صدق جدید ۲۸ جولائی ۶۷ء جلد نمبر ۱۷ نمبر ۳۵

تین بھائی اور تھے ماشاء اللہ سب دیندار شب زندہ دار اور عبادت اور دینداری میں
وہی شاید سب کے پیشوا تھے بھائیوں اور والدہ کی وفات پر صدق میں نوٹ نکل چکے ہیں اب ایک
بھائی رہ گئے ہیں حافظ محمد صدیق صاحب اللہ انھیں مدتوں زندہ وسلامت رکھے مرحوم نے خود بھی
کاروبار سے کنارہ کش ہو کر حجرہ میں کھول رکھے تھے اور سال کا بڑا حصہ وہیں گزارنے لگے تھے ہندوستان اور
مہاراشٹر کے حالات سے مایوس ہو کر ابھی چند مہینے ہوئے کراچی ہجرت کر گئے تھے۔ موت اسی سر زمین
پر آئی۔

اللہ نے مجھے مخلصوں کی ایک بڑی تعداد عطا کر رکھی ہے یہاں مخلصوں اور محسنوں میں سے
ممتاز مرتبہ رکھتے تھے ان کے حسن وسلوک اور خدمات کی تفصیل اب اخبار کے صفحات پر کہاں
بیان کی جائے بہت دراز ہوئے ایک بار روپے تین ہزار کی رقم میرے حوالہ کردی کہ میں اس کو
خیرات وصدقات کی مد میں جس طرح چاہوں صرف کروں اس وقت کے تین ہزار آج کے ۳۰
ہزار کے برابر ہوئے، صدق کی امداد کتنے موقعوں پر اور کن کن طریقوں سے، اس کی تفصیل
اب ذہن میں نہیں، مناجات مقبول کا بھی ایک ایڈیشن انھیں نے اپنے کسی عزیز یا عزیزہ کے
ایصال ثواب کے لئے چھپوایا تھا۔

⁂ ———— ⁂ ———— ⁂

مارچ ۲۹ء میں جب حج کو گیا ہوں اس وقت نوجوان تھے اب ظاہر ہے کہ پوتے نواسے
والے ہو چکے ہوں گے ایسے خوش فہم مخلص کم ہی کسی کو نصیب ہوتے ہیں اور جس کسی کو مل جائیں
اسے بڑی نعمت اس کو حاصل ہو گئی اس خاکسار سے ان کا تعلق دوستانہ نہیں عزیزانہ بلکہ
برادرانہ قائم ہو گیا تھا اور آج جو عزیزی حافظ صدیق کو تعزیت نامہ میں نے لکھا اس میں لکھ دیا
تعزیت آپ کے بھائیوں کی نہیں بلکہ اپنے بھائی ہی کی ہے فی الواقع یہ سوچ کر رہا ہوں کہ
بازو ٹوٹ گیا وقت بازو اٹھ گیا۔
رب کریم وجلیل سے دعا جسم کے روئیں روئیں سے نکل رہی ہے کہ دین وملت کے اس مخلص

دمگرم خادم کو اپنے لطف بے غایت اور کرم بے نہایت کے سایہ میں جگہ دے اور جنت الفردوس کو اس کا دائمی مسکن بنا دے۔

سیّد صدّیق حسن مرحوم

۱۹۰۴ء تا ۱۹۶۳ء

جمعہ کا دن ہے ۱۰ بجے کا وقت اور تاریخ ستمبر کی چھٹی اور ربیع الثانی کی سترھویں کہ ایک ہندوستانی مسافر عازم پاکستان بظاہر تندرست و توانا امرتسر پلیٹ فارم پر اپنا پاسپورٹ افسران متعلقہ کے سامنے پیش کرتا ہے اور ابھی پہلا فقرہ بھی اس کے منھ سے نہیں تمام ہونے پاتا تھا کہ پیمانۂ حیات تمام ہو جاتا ہے۔ حکم قضا بجلی کی سرعت سے پہونچتا ہے اور وہ غریب الدیار اُسی لمحہ اور اُسی آن دعوتِ اجل کو لبیک کہتا ہوا سفر پاکستان کے سفر آخرت پر روانہ ہو جاتا ہے ——— حرم محترم ساتھ میں ہیں بہنوئی کی وفات ناگہانی کا تار پا کر اپنے شوہر کو ساتھ لے حقیقی بہن کے پاس تعزیت میں ملتان جا رہی تھیں۔ آگے بڑھنے سے قبل ذرا ایک منٹ کے لئے اس کی بیکسی اور بیچی کا تصور دل میں لے آیئے جس نے چشم زدن میں اپنے سہاگ کو جیتے جی اپنی بادشاہت کو لٹتے دیکھ لیا! اور وہ بھی کہاں وطن میں اور اپنوں کے درمیان نہیں وطنِ پیدائش راہی تو ہوا، وطن اتنا محبت! لکھنؤ سے سیکڑوں میل دور تمام تر اجنبیوں کے درمیان! بیوہ بہن کے ذمہ پر تو یہ۔ لکھنؤ کے لئے جانے والی سہاگن دم کے دم میں بے خان و مکان خود ہی بیوہ! ——— آگے بڑھنے کا راستہ بند! لکھنؤ واپس آئے تو جنازہ اور لٹے ہوئے قافلے کو ساتھ لئے ہوئے۔ تو کیونکر اور کس طریقہ پر تیز رفتار لاری کا انتظام!

صدق جدید ۲۰ ستمبر ۱۹۶۳ء

سیکڑوں سے اوپر خرچ کے بعد بھی کون کر دے؟ کسی پردہ نشین خاتون پر یہ وقت کبھی کیوں پڑا ہوگا؟ غضب کا المیہ شعر و افسانہ کے خواب ہی نہیں واقعات کی جیتی جاگتی دنیا میں!

یہ غربت و مسافرت میں یوں بالکل اچانک جان دے کر اور جمعہ کا متبرک دن پاکر کسی درجہ میں شہادت کا مرتبہ حاصل کر لینے والا مسافر آخر تھا کون؟

کوئی ایرے غیرے نہیں یو۔ پی کا سب سے سینیر مولمین گورنر کے بعد ریاست کا سب سے اعلا انتظامی عہدیدار بورڈ آف ریونیو کا سینیر ممبر! ــــ نام سید صدیق حسن مولد ضلع الہ آباد کا مشہور قصبہ کڑہ۔ ابتدائی تعلیم لکھنؤ، پٹنہ وغیرہ میں پاکر تکمیل آکسفورڈ یونیورسٹی میں کی، ریاضیات اور عربی زبان دونوں کے خصوصی طالب علم رہے، پھر آئی۔ سی۔ ایس میں بیٹھے اور امتیاز کے ساتھ اس میں کامیابی حاصل کی ۱۹۲۲ء میں ہندوستان پلٹے تو عہدے پر عہدے جلد جلد حاصل کرنے شروع کئے ابھی جائنٹ مجسٹریٹ ابھی کلکٹر ابھی فلاں صیغہ کے سکریٹری ابھی فلاں محکمہ کے ڈائرکٹر لکھنؤ اور فیض آباد کے کمشنر ہوئے اور اب پنشن کے قریب اس اعلا عہدے پر فائز تھے۔ کون جان سکتا تھا کہ موت دنیوی معیار سے اس حیرتناک اور حسرتناک طریقہ پر استقبال کرے گی اور جنازہ ہزار بارہ سو کے خرچ کے بعد بھاگم بھاگ ۲۰-۱۲ گھنٹے کے اندر لکھنؤ پہونچایا جائے گا۔ موت بہ اسباب ظاہر ایک داخلی شریان کے پھٹ جانے سے واقع ہوئی تھی۔ ناک سے خون جاری تھا! اس لئے اور بھی ضروری تھا کہ میت جلد سے جلد اپنے آرامگاہ خاکی تک پہنچا دی جائے ــــ ڈھائی گھنٹے کا وقت تو حکام کی سرد مہری اور ضابطہ پرستی کی نذر ہوگیا تھا اور اسٹیشن کے قلیوں بیچاروں نے اگر پوری مستعدی سے کام نہ لیا ہوتا تو خدا جانے کتنی اور تاخیر واقع ہوتی۔

اس طرح و شرافت کے انسان اور اس دل و دماغ کے مسلمان کم تر ہی دیکھنے میں آتے ہیں وضع ظاہری کی سادگی دیکھئے تو اس مرتبہ کو گویا اس سے کہیں کم درجہ کے بھی افسر نظر نہ آتے۔ گھر ہی پر نہیں اکثر تقریبات میں دیکھئے تو بغیر شیروانی کے محض کرتہ پائجامہ پہنے نظر

آسے ہے ہیں جگہ جہاں مل گئی بس وہیں بیٹھ گئے تواضع کا یہ عالم کہ بڑھنا اور آگے چلنا تو جانتے ہی نہ تھے بس دوسروں کو ہی آگے بڑھاتے اور خود لطف پیچھے چلنے میں محسوس کرتے غذا بھی ایسی ہی سادہ بلکہ پرہیزی، موٹر دوسروں کی سواری کے لئے وقف تنخواہ کا بڑا معقول حصہ عزیزوں بلکہ بیگانوں کی امداد کی نذر عقائد میں بڑے پختہ، نماز روزے کے پورے پابند عجب نہیں کہ تہجد گزار بھی ہوں حج سے بھی فراغت کئے ہوئے داد و دہش اور لوگوں کو خفیہ وعلانیہ امداد کی تو کچھ پوچھئے ہی نہیں، عزیزوں اور اپنوں سے لے کر غیروں بیگانوں تک کسی پر فیض کا دروازہ بند ہی نہیں مسلمانوں کے ہر کام میں پیش پیش ہر ادارہ کی خدمت جیب سے بھی اور زبان وقلم سے بھی سرگرم عمل لکھنؤ کے چھوٹے بڑے ہر ادارہ کرامت حسین گرلز کالج، اصلاح المسلمین، ایک آنہ فنڈ وغیرہ کی سرپرستی شغل زندگی علی گڑھ اور ندوہ دونوں سے خصوصی تعلق بااخلاص اور ندوہ سے تو کہنا چاہئے کہ عشق جہاں کہیں بھی رہے سرکاری حلقوں کے لئے بھی ایک علمی اسلامی ماحول پیدا کر دیتے۔

اسلامیات کا مطالعہ انگریزی وار دو دونوں میں بڑا وسیع، عربی کے بھی قدیم وجدید ذخیرہ دینیات پر نظر علم کی تشنگی اس پر بھی نہ بجھتی اور علم دین کی طلب برابر جاری رہتی لکھنؤ میں ندوہ کے شیخ التفسیر مولانا محمد اویس ندوی نگرامی کو گویا باقاعدہ اپنا استاد مقرر کر لیا تھا ہر ہفتہ اپنی کوٹھی پر حلقہ درس منعقد کرتے مولانا کو اپنی سواری بھیج کر بلاتے اور حلقہ درس میں دوسرے مسلمان عہدیداروں کو بھی شریک کرتے کسر نفسی کا یہ عالم کہ باوجود اچھے خاصے عربی داں ہونے کے اپنے کو ظاہر یوں کرتے کہ جیسے مبتدی بھی نہیں۔!

اسلامیت خاموش مطالعہ تک محدود نہ تھی موقع پاتے تو قلمی جہاد میں بھی مدد نہ تھے انگریزی تحریر پر اردو ہی کی طرح قادر تھے۔ ڈیڑھ سال اُدھر کی بات ہے کہ الہ آباد ہائی کورٹ کے جسٹس دھون نے اپنی تقریر میں خواہ مخواہ قانون اسلام پر

پرنکتہ چینی کرتی. مثلاً سود کی حرمت سے مسلمانوں میں تجارتی ترقی اور حوصلہ مندی رک گئی
تقسیم وراثت نے مسلمانوں کی مالی حالت منقسم کر دی وغیرہ مرحوم سے اس کی برداشت
نہ ہوسکی ایک مفصل و مدلل مضمون بڑے شائستہ و متین انداز میں لکھ کے روزنامہ نیشنل
ہیرالڈ میں شائع کرا دیا. اور اس سے جریدۂ اسلام (کراچی) نے بھی نقل کیا صدق ۱۲ اپریل ۶۹ء
صفحہ ۱۹ میں اس کا ذکر موجود ہے' اردو میں بھی برابر کچھ نہ کچھ لکھتے ہی رہتے صدق
ہی میں اُن کے قلم سے نکلے ہوئے متعدد مراسلے نکل چکے ہیں نام کا اظہار ان کے سرکاری
مرتبہ و منصب کے لحاظ سے مناسب نہ تھا اس وقت بھی تدوین قرآن پر ایک پوری کتاب
تحقیق سے لکھ رہے تھے وفات سے دو ہی تین ہفتہ قبل اس کا مسودہ دیکھنے کو
عنایت کیا تھا. عملی زندگی پوری اقبال کے اس شعر کی تفسیر و تصویر ؎

ہو حلقہ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن .

اچھے اور پختہ کار مومن یعنی متعصب مسلمان کے نہیں اور اسلام ہرگز حقوق وطن و ہمسایگی
کی ادائی میں حائل نہیں ہوتا. مرحوم ایک زندہ پیکر اس توازن اور جامعیت کا بہترین نمونہ تھے
تھے. بالادست ہندو افسران کے کام سے انتظام سے مزاج سے خوش اور برابر کے
ہندو و ہم عہدہ داران ان کی محبت کا کلمہ پڑھتے رہے سول سروس کے ایک ساتھی اے بی
سنگھ تھے ان پر غلط یا صحیح ایک مقدمہ قتل عمد کا چل گیا اچھے اچھے ساتھی ان کے سایہ
سے بھی بھاگنے لگے اس وقت جس نے پورا حق رفاقت دوستی ادا کر کے دکھا یا وہ ان
ہی کا یہی مسلمان رفیق تھا ——— انھوں نے یہی نہیں کہ دس ہزار کی گرانقدر ضمانت
پیش کر دی بلکہ کچھ ہی دن کے بعد جب وہ قید ہستی سے رہائی پا گئے تو ان کے دونوں
یتیم لڑکوں کی کفالت اپنے ذمہ لے لی. ولایت بھیج کر انھیں تعلیم دلائی اور ان کی
شادیوں کے مصارف بھی اپنے سر لے لئے. اس طرح کی مثالیں اس زمانہ میں تو عنقا

کے حکم میں ہیں۔

یوپی میں بھودان تحریک والے آچاریہ ونوبا کو جب ۵ لاکھ ایکڑ زمین مل گئی تو اہم اور پیچیدہ سوال اس زمین کی تقسیم و انتظام کا پیش آیا۔ اس وقت کے وزیراعلا (کسی اور نے نہیں) ڈاکٹر سمپورنانند نے بلا توقف کہا کہ اس بڑے کام کے لئے اس کمیٹی کی چیرمینی کے لئے ہمارے یہاں صدیق حسن سے بہتر کوئی افسر نہیں مل سکتا مسلمان قوم کو دنیا میں سربلند کرنے والی ہستیاں بس ایسی ہی ہو سکتی ہیں۔

شعروادب کے بھی ماہر اس وجہ سے کہ جتنے کسی اور چیز کے مدتوں میں بدگمان رہا کہ اپنی سرکاری منصبی مصروفیتوں کے ساتھ یہ اچھے شاعر بھلا کیسے ہو سکتے ہیں آدی ذہین ہیں بس کبھی کبھی شوقیہ اور بطور تفریح ایک آدھ ہلکی پھلکی غزل کہہ لیتے ہوں گے اور اس بدگمانی نے عرصہ تک ان کی نظمیں توجہ کے ساتھ پڑھنے ہی نہ دیں لیکن بالآخر جب ایک بار ان کی نظم خیال کر کے پڑھی تو آنکھیں کھل گئیں۔ شاعرانہ خوبیاں اور لطافتیں ساری کی ساری موجود! اپنی خفت مٹانے کو انھیں خط لکھا کہ آپ تو چھپے رستم نکلے میں سمجھا تھا کہ طبع موزوں رکھتے ہیں کبھی کبھی شوقیہ کچھ کہہ لیتے ہوں گے اب معلوم ہوا کہ ماشاءاللہ آپ پورے شاعر ہو نا کیا معنی کچھ استادانہ سا درجہ حاصل کئے ہوئے ہیں اور یہ تاثر بعد کو اُن کی ہر نظم سے متعلق قائم رہا میرے ساتھ اردو کتابوں کی سرکاری انعامی کمیٹی کے ممبر تھے۔ اس میں بھی ان کی سخن فہمی جوہر شناسی صحیح نقطہ نظر کے نمونے بار بار دیکھنے میں آتے رہے۔

اور اپنے ذاتی تعلقات کو کیا کہوں۔ صدق کے مخصوص قدرافزاؤں میں سے تھے اور میری ہر کتاب کی حوصلہ افزائی ہی کرتے رہتے، اگرچہ میری کتابوں کی جواب گرانی ہے ظاہر ہی ہے

کرتے کہ اسلامیات سے متعلق انگریزی کی جو نئی کتاب خریدتے پہلے میرے ہی پاس بھیجدیتے اور جب میں اُسے واپس کرتا تب اُسے پڑھنا شروع کرتے. عام برتاؤ عزیز کا سا کیا، بڑا قریب کا سا تھا. آخری ملاقات وفات سے کل پانچ دن قبل پہلی ستمبر کی شام تک رہی تھی. ندوہ کے جلسۂ انتظامیہ میں شرکت کے بعد حسب معمول اپنی سواری پر پہنچانے میری قیام گاہ تک آئے.

عزیز دوست، اور پیارے مخلص، رخصتی سلام قبول ہو تمھارے حسن انجام کی شہادت دینے کو جمعہ کے دن اور عالم مسافرت کی موت ہی کافی نہیں بلکہ تمھارے سوگواران کا ہجوم عظیم اور خدا جانے کتنی بیواؤں کی آہیں یتیموں کے آنسو اور ناداروں کا نالہ و فریاد، مبارک ہو تم کو کہ تمھیں غسل میت ندوہ کے شیخ التفسیر نے اپنے ہاتھوں سے دیا، ندوہ کے سابق شیخ الحدیث مولانا محمد منظور نعمانی نے نماز پڑھائی اور جنازہ برداروں میں مولانا ابوالحسن علی ندوی اور کتنے ہی نامی مشائخ اور صالحین شامل رہے، نیکی و شرافت کے تم ریکارڈ قائم کر گئے. اور دنیا کو صدیقیت کا ایک عملی درس دے گئے!

• بارگاہ بے نیاز، و جبروت احکم الحاکمین میں کسی کو دم مارنے کی مجال ورنہ جی تو بے اختیار چیخیں مارتے ہوئے یہی عرض کرنے کو تھا کہ اپنی عزت و اجلال کے صدقے ہم بے بہرہ کی آزمائش اتنی سخت نہ فرما کہ ہمارا ظرف تحمل جواب دے اٹھے لیکن نہیں تیری آزمائشیں تو سدا ایسی ہی رہی ہیں. نادان بندوں کی مصلحت بینی سے کہیں بالاتر. مرسلین مقبولین تک جھٹکے کھاتے پکار اٹھے متی نصر اللہ اور موسی کلیم نبی اولو العزم تک کی زبان سے نکل گیا ان ہی الا فتنک اور رمز شناس عارفوں نے آخر کچھ سمجھ کر ہی تو تیری زبان سے ادا کیا ہے ؎

ما پروریم دشمن و ما می کشیم دوست
کس را رسد نہ چون و چرا در قضائے ما

مولوی مسعود علی ندوی مرحوم

ایک بہت ہی محدود حلقہ کو چھوڑ کر اب اس نام ہی سے کون واقف رہ گیا ہے تحریک خلافت کے دور شباب سنہ ۲۰ء و سنہ ۲۲ء میں یگانگی اور بے نشانی نہ تھی۔ ترک موالات والی کی ایک دنیا مولانا شوکت علی کے اس خلیفہ یا لفٹنٹ کے نام اور کام سے گونج رہی تھی اور پنڈت موتی لال نہرو، جواہر لال کا گھر آنند بھون بھی ان کے قدوم میمنت لزوم سے نا آشنا نہ تھا۔ عمر کی آخری سانس ۱۴ اگست سنہ ۶۴ء کو لی۔ شہرت عمر کی بے وفا زندگی سالہا سال پہلے ساتھ چھوڑ چکی تھی۔

بارہ بنکی ضلع میں مسولی اور بانسہ سے قریب ایک چھوٹا سا قصبہ بھیارہ ہے۔ وہیں خاندان قدوائی کی ایک شاخ میں اور ایک زمیندار کے گھر میں آنکھ کھولی وجیہہ و شکیل شروع سے تھے اور عملی انتظامی کام میں پیش پیش سنہ ۱۹۰۸ء میں مجھ سے ملاقات ہوئی سن میں وہ مجھ سے ڈیڑھ دو سال بڑے ہوں گے میں اسکول کے نویں دسویں درجہ میں تھا۔ رفتہ رفتہ بے تکلفی بڑھی رسم اخلاص سالہا سال قائم رہی رفاقت و شناسائی بالآخر ۶۰ سال کے بعد تمام ہوئی اتنی مدت میں خدا معلوم کتنے انقلابات ہوئے کتنے اتار چڑھاؤ پیش آئے کبھی ادھر سے کبھی ادھر سے جیسے کہ انسانی تعلقات میں پیش آتے ہی رہتے ہیں مدت تعلق کی یہ درازی خود ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

شہرت نے لڑکپن ہی سے قدم لینے شروع کر دیئے تھے۔ آج طلبہ کی اس ٹولی کے سردار کل اسٹرائیک کے علمبردار، مولانا شبلی پر اپنے حسن خدمات سے سکہ بیٹھا دیا تھا

ماخوذ از صدق جدید ۱۱ ستمبر سنہ ۶۴ء جلد نمبر ۱۴ شمارہ نمبر ۴۱

استاد کی وفات کے وقت جب علمی جانشین کی دستار فضیلت سید سلیمان کے سر بندھی تو دار المصنفین کے پریس اور سارے کاروبار کی منیجری کا خلعت انھیں کے جسم پر راس آیا اور مدتوں اسے خوب ہی انھوں نے نباہا۔

ٹینس کے اچھے کھلاڑیوں میں شمار ہوتے تھے شکار کے شوقین اور دوڑ دھوپ کے ہر کام میں منجھے ہوئے تھے سانپ کو دوڑ کر مارتے تھے۔ خوش انتظامی خوش دماغی اور جفاکشی کے پتلے تھے اور زندہ دلی شگفتہ مزاجی کے بادشاہ رودولوں کو جب چاہا ہنسا دیا روٹھوں کو جب چاہا منالیا اسم مسعود کی نسبت سے پورا نام سالار مسعود غازی ہم نیاز مندوں کی زبان پر چڑھا ہوا تھا ـــــ مزاحاً مجھے میاں کہہ کر مخاطب کرتے رہے اور میں بھی جواب میں انھیں استاد کہنا شروع کر دیا تھا۔

حضرت تھانویؒ سے مدتوں باغی رہے پھر زمانے نے پلٹا کھایا تو ایسا کہ ان کے قدموں ہی سے لگ گئے تھانہ بھون جا کر لمبی حاضری دی اور بالآخر چھوٹی خلافت (مجاز صحبت) کی سند پائی اوراد و نوافل وغیرہ کے اس وقت سے شدید پابند ہو گئے تھے۔

برسوں قبل بیمار ہوئے اور پھر ایسا گرے کہ ہر ممکن علاج و تدبیر کے باوجود ہر روز اور زیادہ ہی گرتے چلے گئے پہلے پیروں نے جواب دیا ادھر بصارت نے آنکھیں چرانا شروع کیں اور ادھر سماعت سے بے بہرہ ہو گئے۔ گھس کر بھی چلنے کی سکت نہ رہی اور ٹینس کے کھلاڑی اور شکار کا میدان مارنے والے کے لئے یہ دن بھی آ گیا کہ وہ دو مضبوط و توانا آدمی ادھر ادھر بغل میں ہاتھ دے کے ہاتھوں میں ٹانگ لیتے اور سامان کی گٹھری کی طرح اٹھاتے اور یہاں سے اٹھا کر وہاں رکھ دیتے۔ اللھم احفظنا یہ دردناک اور عبرت انگیز نظارہ ہفتوں نہیں مہینوں بلکہ برسوں دیکھنے میں آتا رہا۔

مرحوم و مغفور کی اہم ترین یادگار دو مسجدیں ہیں ایک احاطہ دار المصنفین اعظم گڑھ میں اور دوسری احاطہ دار العلوم ندوہ میں خوش سلیقگی، نفاست اور سامان راحت کی

جامعیت میں اپنی نظیر آپ جب تک ان مسجدوں میں ایک نمازی بھی باقی رہے گا۔ اجر بے حساب وغیر منقطع اس میں تعمیر کے نامۂ اعمال میں ثبت ہوتا رہے گا۔

~~~~~~

○

"جشنِ نوشابہ"

لکھنؤ ۲۹ مارچ جمعہ ۱۰ بجے صبح، مرشد آباد پیلیس دفتر حق وصدق) کی بارہ دری میں اس وقت یہ چہل پہل کیسی ہے؟ چہل پہل ماتمی رنگ کی۔ جسے دیکھئے روئے دیتا ہے، رو ہی رہا ہے، ہنسنا مسکرانا جیسے سب بھول ہی گئے ہیں، گھر اندر، باہر بھرا پڑا ہے! بچے بھی بلکتے بھی، بوڑھے بھی بچے بھی، عوام بھی خواص بھی پر یہ کیا کہ ہر آنکھ میں آنسو، ہر لب پر آہ وفغاں! یہ حق والے عباسی صاحب تو بڑے ہنس مکھ، صابر وضابط تھے۔ انھیں کیا ہو گیا کہ خود چیخ چیخ کر رو رہے ہیں اور دوسروں کو بے اختیار رُلا رہے ہیں! اور ان کے بڑے بھائی تو شاید اُن سے بھی بڑھ کر خوش مزاج تھے اور کہیں باہر بہت دُور رہا کرتے تھے، یک بیک کیسے آ گئے۔ روتے

منقول از صدق ۱۰ اپریل ۱۹۳۶ء
~~~~~~

جاتے ہیں اور شاید زیرِ لب کچھ پڑھتے بھی جاتے ہیں! یہ گھر کی بڑی بڑی عفیف پردہ نشین بیویاں۔ ان کی تو آواز تک کا پردہ تھا یہ کیا کہ بے اختیار سب باہر کی طرف ٹوٹی پڑتی ہیں۔ ساری رات تک سخت رو کر و کر کاٹی ہے کل دن ہی سے رو رہی ہیں، جمعرات کی دوپہر سے جمعہ کی صبح کا وقت آگیا۔ مسلسل اور بے ساختہ ایک عالم رونے پیٹنے کا ہے! کسی نے اس مدت میں کھانے پینے کا نام اس گھر میں جانا ہے! —— سامنے دیکھئے زنانہ دالان میں اجلی شفاف چادروں میں لپٹی ہوئی، تازی نہائی دھوئی ہوئی کافور اور عطر کی خوشبو میں بسی ہوئی گھر بھر کی مینا، بیٹی نوشابہ پلنگڑی پر لیٹی ہوئی ہے! —— اچھا تو یہ جشنِ نوشابہ ہے وہ پرانا جشنِ مسرت نہیں مجلسِ ماتم، نوحۂ غم اور نغمۂ مسرت کے درمیان فرق ہی کیا ہے۔؟

اک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی، نغمۂ شادی نہ سہی

✕————— . —————✕

سنا تھا کہ ماں باپ کو اپنی اس گڑیا کی شادی رچانے کا بڑا ارمان ہے ارمان کیسے نہیں ہوتا؟ یہاں تو اولاد کے داغ پر داغ اٹھانے کے بعد سات آٹھ اولادوں کو خاک میں سلانے کے بعد یہی ایک زندہ سلامت بچی تھی۔ سارے لڑکوں سے بڑھ کر یہ ایک لڑکی عزیز ماں باپ کی آنکھوں کا تارا۔ گھر بھر کی امید دل کا مرکز لڑکی ابھی گھر ہی میں ہے کہیں لینے جانا نہیں بیاہ ہو ابھی اپنی ہی اولاد ہوتی ہے تو کہیں لڑکی کی رخصتی ہی تو نہیں ہو رہی ہے؟ بارہ برس کا سن شادی کا سن تو نہیں ہوتا لیکن عجب کیا جو ارمان کے مارے ہوئے ماں باپ نے اسی سن میں شادی اور رخصتی کی ٹھہرالی ہو! —— بیشک نوشابہ آج رخصت ہو رہی ہے پھاٹک پر سیاہ رنگ کی لاری بھی لگی ہوئی ہے رخصت وہاں کے لئے ہو رہی ہے جہاں جا کر پھر کوئی واپس نہیں آتا۔ معصوم نے کل ہی اپنی بہنوں سہیلیوں سے کہا بھی تو تھا کہ اب ہم اپنے گھر جا رہے ہیں۔ ہمارا کہا سنا معاف کرنا۔ وہ دیکھو سفید موٹر گھر سے

ہوئے ہیں تو ـــــ بچوں کا انکشاف بہت قوی ہوتا ہے عجب کیا جو برزخ کا انکشاف قبل سے ہوگیا ـــ تو کیا، وہ ہنستی کھیلتی بھولی بھالی، نیک سیرت و مقبول صورت، محلہ کے غریبوں کو پیسے بانٹنے والی، پڑوسیوں کے دل میں جگہ رکھنے والی لڑکی دنیا سے رخصت ہو ہوگئی ـــــــ ؟ کل دوپہر کو اسی طرح کا فقرہ حسرت نصیب باپ کی زبان سے سنا بھی تو تھا۔ کسی آنے والے عزیز کو خبر دے رہے تھے۔ بی بی پالی، ۱۲ برس کی اکلوتی کے لئے موت کا لفظ ان کی زبان سے نکلا کیونکر، تلفظ ادا کرنے پر قدرت ہی زبان کو کیسے رہی ؟

اور پردہ نشین غمزدہ ماں! لوگ کہتے ہیں کہ وہ تو رو بھی نہیں سے محض سکتہ کا عالم طاری ہے بیشک آنسو سلب ہوگئے ہوں گے لیکن کلیجے کی کھرچن کو کیا کر رہی ہوں گی ؟ ہر لمحہ جو زیر دست ہوک سینہ میں اٹھتی ہوگی اس کا کیا علاج ہے ؟ بہتر کی نہیں آخر گوشت پوست ہی کی بنی ہوئی عاجز و ناتواں مخلوق ہیں، آرزوؤں اور تمناؤں کے ہرے بھرے باغ کو لٹتے ہوئے دیکھتے ہوئے خود زندہ کیسے رہیں ؟ ہوش و حواس پر قابو رکھنے کی قوت و توانائی کس نے دیدی ؟ کیسے کرشمے امتحان مالک و مولیٰ کے دربار میں پیغمبروں اور خاص خاص برگزیدہ بندوں کے ہوا کرتے ہیں کیا ان عاجز و ناتواں بندوں بندیوں کو بھی اسی مرتبہ پر پہونچانا منظور ہے ؟

در و دیوار بھی مرشد آباد ہاؤس کے اگر اس وقت رو رہے ہیں تو حیرت نہ کیجئے اس سے بڑھ کر پُر درد و درد انگیز منظر اس نے دیکھا کب ہوگا ؟

لوگ کچھ پوچھنے کو آئے ہیں　　اہلِ میت جنازہ ٹھہرائیں
لائیں گے پھر کہاں سے غالبؔ کو　　سوئے مدفن ابھی نہ لیجائیں

"سوئے مدفن" یہاں کیسے لئے جا رہے ہیں! لڑکی کے دن یہ کھیلنے کھانے کے تھے، دوڑنے پھرنے کے تھے، گڑیا گڈے کے بیاہ رچانے کے تھے یا "سوئے مدفن لیجانے کے تھے" ؟ لیکن شور و شیون کے ہنگامہ میں ذرا کان لگا کر سنیئے تو غسل دینے والیوں کا بیان ہے کہ غسل والی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی، عجب نہیں جو ہنس ہنس کر کچھ کہہ بھی رہی ہو۔ دل کے کانوں سے سنئے، صدا

کچھ اس طرح کی آرہی ہے: میری امی! یہ آپ کا رونا بلکنا سب آپ کے حق میں رحمت ہو رہا ہے دنیا سے معصوم جا رہی ہوں پھر آج جمعہ کا دن ــــ انوار اور رحمتوں کی وہ بارش کہ میں خود اس میں گم ہوئی جا رہی ہوں ــــــ اپنے پیارے ابّو کو دیکھ رہی تھی، کیسا دھڑا دھڑ روپیہ میرے دوا علاج میں صرف کر رہے تھے جیسے کہیں کے امیر کبیر ہیں! آخر میرے ہی تو جوڑ جوڑ کر رکھنے والے تھے، میرے فرض سے سبکدوش ہو گئے۔ امانت اپنے مولا کو کو واپس پہونچ گئی۔ یہ جدائی کے دن، دن ہی کتنے ہیں۔ اپنے آن آقا سردار کی یاد میں کاٹ دیجئے، جنھوں نے اپنی ایک نہیں دو دو اور کنواری نہیں بیاہی ہوئی جوان جوان صاحبزادیوں کو کفنایا، دفنایا، اپنے ہاتھوں قبر میں اتارا، مٹی میں سلایا، اپنے مالک و مولیٰ کی سپردگی میں دیا۔ آپ کو تو انھیں کی کنیزی پر فخر ہے، انھیں سے سبق صبر کا بھی لیجئے، میرے لئے زیادہ نہ کڑھیئے یہ چند روزہ پردہ اور حجاب تو آپ ہی کی مصلحت کے لئے ہیں۔ میں تو آپ لوگوں کی بخشش کا ذریعہ اور حیلہ بن رہی ہوں، دنیا میں تو آپ کی خدمت کر ہی کیا سکتی تھی: آپ کی شفقتوں کا بدلہ کسی درجہ میں بھی کہاں دے سکتی تھی۔ یہاں البتہ ان شاء اللہ حوض کوثر پر آپ سے ملوں گی۔ بڑھ کر اور لپک کر آپ سے لپٹوں گی، مچلوں گی۔ آپ دونوں کی انگلی پکڑ کر جنت میں لے چلوں گی۔ یہ وعدے سچے کی زبان سے آپ کو پہونچ چکے ہیں۔ اور سچے کے وعدے غلط نہیں ہوتے "
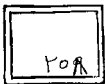
ایک قوّال

دریا باد ۲۴ فروری ۱۹۳۶ء دوپہر میت کو دفن کئے ابھی چلا آرہا ہوں۔ کل دن میں جاکر
نزع کی حالت میں آب زمزم بھی تو پلایا تھا۔ مرنے والے کا نام افضل حسین تھا۔ عمر ستر سے
کچھ اوپر۔ "پیشہ" یا "ذات" کے لحاظ سے قوال تھے ـــــ قوال کا ذکر صدق کے صفحات
میں! ـــ جی ہاں صدق، عالموں، زاہدوں، عابدوں کا پرچہ کب ہے، نامۂ سیاہ صدق ایڈیٹر
تو خود ہی ایک عامی اور عاصی ہے، اپنے ہی جیسوں کا ذکر جی لگا کر کرتا ہے ـــ ہاں تو یہ جوانی
کے زمانہ میں نامور قوالوں میں تھے، رودولی کی چوکی کا ستارہ چوٹی کی چوکیوں میں تھا۔ آواز میں ایک
خاص گداز و درد و اثر تھا۔ اب مدت سے نماز اور تلاوت کے شدت سے پابند تھے نماز بڑے
اہتمام سے اور دل لگا کر پڑھتے۔ قرآن مجید کے کئی ایک پارے اس سن میں حفظ کر لئے
تھے۔ لکھنؤ میں کچھ دن جم کر رہنے کا موقع ملا۔ تو مدرسہ فرقانیہ والوں کے پاس بیٹھ کر
کچھ تجوید بھی حاصل کر لی تھی۔ اذان بڑے شوق کے ساتھ اور موثر لہجہ میں دیا کرتے۔
بڑے پرانے ہم نشین تھے۔ روزانہ سہ پہر کو آتے۔ بیٹھنے کا معمول ۴، ۵ سال

صدق ۱۹۳۶ء

سے تھا مصاحبت اور علم مجلس کا سلیقہ تھا۔ جب بیٹھے تھے بارہا دل کو گرمایا تھا ـــــ اہلِ
دانم آکم نے برسوں سماع سنا ہے ـــــ محفل کے باہر جتنا اپنے لطیفوں سے ہنساتے تھے محفل
کے اندر اسی قدر اپنے پُر اثر ترنم سے رُلاتے تھے۔ نزع کے وقت جب قبلہ رخ چہرہ کر رہے
کھینچ رہا تھا اور زیرِ لب اللہ اللہ جاری تھا ـــ تو عبرت کی آنکھ روئی اور زبان نے دیکھنے والو
سے کہا یہ وہی شگفتہ چہرہ ہے جو گھنٹوں ہنسا ہنسا تا رہتا تھا ـــــ زندگی کا آغاز تمام تر فسق کی
غفلتوں سے ہوا اور خاتمہ رسولؐ کی محبت اور قرآن کی تلاوت پر ہوا۔ دل میں آخری ارمان
حج بیت اللہ اور زیارت مدینہ کا تھا ـــــ صحبت و رفاقت کا حق بڑا حق ہوتا ہے۔
نماز جنازہ پڑھانے جب ایک آوارہ و ناکارہ کھڑا ہوا تو آمرزگار کے حضور میں دعا دل سے یہ
نکلی کہ اے مغفرت و رحمت پر چڑھیں الگ دمولی شہرے دربار میں ایک بوڑھا نمازی حاضر
ہو رہا ہے۔